UNIVERSAL LIBRARY
OU_222735
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

اردو زبان کے قدیم مرکزوں کے شاعروں اور ادیبوں کی خدمات کی تاریخ

دکنی ادب کی تاریخ

یعنی TEXT BOOK

اردو زبان کے قدیم مرکزوں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور
گولکنڈہ، حیدرآباد، اورنگ آباد کے شاعروں
اور ادیبوں کی اردو خدمت کی
تفصیلی تاریخ
(۱۳۵۰ء تا ۱۷۵۰ء)

مرتبہ

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

تعداد :- ۵۰۰

PRICE RS. 5/=

قیمت :- تین روپے پچاس پیسے
PRICE RS. 5/=

طابع :- یونین پرنٹنگ پریس دہلی

ناشر :- بک امپوریم اردو بازار دہلی

دکنی ادب کی تاریخ

۱۳۵۰ تا ۱۷۵۰ ع

۱۔ مقدمہ	۷
۲۔ بہمنی عہد۔ گلبرگہ اور بیدر (۱۳۵۰ - ۱۵۲۵ ع)	۹
۳۔ عادل شاہی عہد۔ بیجاپور (۱۴۹۰-۱۶۸۶ ع)	۲۸
۴۔ قطب شاہی عہد۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد (۱۵۰۸ - ۱۶۸۷ ع)	۶۲
۵۔ مغل عہد۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد (۱۶۸۶ - ۱۷۵۰ ع)	۱۰۰
۶۔ دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر	۱۵۲
۷۔ اشاریہ	۱۶۹

مقدمہ

قدیم دکنی ادب کی تاریخ میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب سے تیس سال قبل جب میں نے ۱۹۲۸ء میں "اردو شہ پارے" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی نہ دکنی ادب کا چرچا تھا اور نہ عام اردو دانوں کو معلوم تھا کہ اردو زبان میں تین چار سو سال قبل اتنی اعلیٰ درجہ کی نظم و نثر لکھی گئی ہوگی۔ "اردو شہ پارے" نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور بزرگی قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ مگر اپنے موضوع پر ابتدائی کوشش ہونے کی بنا پر اس میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ بعض شاعروں کے حالات میں قطعیت نہ تھی، اور بعض بیانات ظن اور قیاس پر مبنی تھے۔

تیس سال کے اس طویل عرصہ میں متعدد ادیبوں اور محققوں نے اس طرف توجہ کی اور دکنی ادب کے گوناگوں گوشوں کو اجاگر کیا اور کئی نئے شاعر اور ادیب روشناس کئے گئے۔ معلومات میں اضافہ کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اور جاری رہے گا۔ اس لئے کہ ایک تو اب اہل علم اس کی اہمیت سے واقف ہو گئے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ۱۹۴۸ء میں دکن کی چھ سو سالہ سیاسی یک جہتی کا شیرازہ بکھر جانے کے باعث اس علاقہ کی مختلف قدیم آبادیوں کے گھریلو کتب خانوں کی کتابیں باہر آ رہی ہیں۔ اور ان لوگوں کی دسترس تک پہنچ رہی ہیں جو ان کو پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پہلے ناواقف لوگ ان کو اپنا خاندانی ورثہ اور متبرک ذخیرہ سمجھ کر سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ اور اب واقف کار

لوگ ان کی ادبی اہمیت اور تاریخی قدر و قیمت کے باعث ان کو آنکھوں سے لگا رہے ہیں۔

اس طرح اردو ادب کی تاریخ میں نت نئے ناموں اور چھوٹی بڑی کتابوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا یہی وجہ ہے کہ میں اپنی اس چھوٹی سی کتاب کو دکنی ادب کی تاریخ پر حرف آخر نہیں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے ذریعے سے اس خطۂ ملک کی علمی و ادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں میں متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب محققوں کے لئے نہیں بلکہ طلباء اور عوام کے لئے ہے اور اگر اس کو ایک اچھی کتاب کی شکل و صورت میں پیش کیا گیا تو یقین ہے کہ مفید و مقبول ثابت ہوگی اور دکن کے قدیم خدمت گذاران اردو کے کاموں اور ناموں کے سمجھنے اور سمجھانے میں حسب ضرورت مدد دے گی۔

حیدرآباد
۲۵ر دسمبر ۱۹۵۸ء

سید محی الدین قادری زورؔ

عہد بہمنی

۱۳۵۰ تا ۱۵۲۵ء

دکن کے تمدن کی تعمیر میں جتنا بہمنیوں کا حصہ ہے کسی اور سلسلۂ سلاطین کا نہیں ہے۔ انھوں نے جب اس ملک میں اپنی سلطنت قائم کی تو یہاں کے مختلف علاقوں میں مختلف راجاؤں کی حکومتیں تھیں۔ انھوں نے اپنی حکمت عملی سے مہاراشٹر۔ کرناٹک اور تلنگانہ تینوں ثانی علاقوں کو ایک ہی سیاست اور حکومت کے تحت متحد کیا۔ ان میں سے ہر ایک علاقہ میں کئی حکومتیں قائم تھیں جو آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔ سنہ ۱۳۵۰ء کے بعد سے یہ علاقے بہمنی سلطنت میں شامل ہوکر امن و امان کے گہوارے بن گئے۔ اور چونکہ مختلف زبانوں اور مذہبوں کی رعایا کو بہمنیوں نے یک جا کیا تھا اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ یہ رنگا رنگی ختم ہو اور ایک طرح کا بین قومی اتحاد اور رواداری پیدا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دکن میں جو بین قومی اتحاد اور باہمی رواداری ایک طویل زمانہ کی فتنہ سامانیوں اور انقلاب کے

باوجود اب تک نمایاں ہے۔ وہ بہمنی حکمت عملی سے پیدا ہوا تھا اس خاندان نے سنہ ۱۳۴۷ء سے سنہ ۱۵۲۵ء تک اس ملک کی تہذیب و معاشرت اور ادب و سیاست کی رہنمائی کی اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑ گیا جو اس کے نام اور کام کو یاد دلاتی رہیں گی۔

ان یادگاروں میں سب سے اہم اردو زبان اور ادب ہے۔ جو انہی کی سرپرستی میں پورے دکن میں یعنی بحیرۂ عرب سے لے کر بحیرۂ بنگال تک رائج ہو گیا اور اس وسیع ملک میں جگہ جگہ اس کے مرکز قائم ہو گئے۔ جن میں گلبرگہ۔ بیدر۔ قندھار۔ گوگی احمد نگر۔ بیجاپور۔ گولکنڈہ۔ کرنول۔ کڑپہ۔ ویلور۔ مدراس بودھن۔ اورنگ آباد وغیرہ تاریخ ادب اردو میں اب تک یاد کئے جاتے ہیں۔

بہمنیوں کی ادب پروری کی طویل داستانیں ہیں جن کی ایک معمولی مثال وہ واقعہ ہے جو اکثر تاریخوں میں درج ہے کہ اس خاندان کے ایک بادشاہ سلطان محمد شاہ ثانی ۱۳۷۸ء-۱۳۹۶ء نے فارسی کے مشہور شاعر خواجہ حافظ شیرازیؒ کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور وہ دکن کے ارادے سے نکلے اور جہاز میں سوار ہوئے لیکن باد مخالف سے گھبرا کر جہاز سے اتر گئے اور معذرت میں ایک غزل لکھ کر بھیجی جو بہت مشہور ہے۔

اس خاندان کے حکمرانوں میں فیروز شاہ بہمنی علم و فضل اور شعر و سخن کے علاوہ بین قومی تمدن کو رائج کرنے میں اسی

طرح مشہور ہوا جس طرح بعد کے زمانے میں جلال الدین اکبر بادشاہ محمد علی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی مشہور ہیں۔ اور دراصل اسی کے عہد سے ہمیں اردو کی نشر و نظم کا پتہ چلتا ہے اور اس کا پایۂ تخت گلبرگہ دکن میں اردو کا پہلا مرکز تھا۔ یوں تو اس سے پہلے کے ایک بزرگ شیخ عین الدین گنج العلم کا ذکر بھی ملتا ہے جو دلی میں پیدا ہوئے اور محمد تغلق کے عہد میں دکن چلے آئے تھے۔ اور طویل عمر پاکر بیجاپور میں فوت ہوئے۔ ان کے بعض مذہبی اردو رسالوں کے نام ملتے ہیں۔ لیکن ان کے نمونے اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا

سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ء ۱۴۲۲ء)

پہلے اردو کے شاعر ہیں جن کی نثر اور نظم دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ اور چھپ چکے ہیں۔ وہ شہباز تخلص کرتے تھے۔ دولت آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شاہ راجو کی وفات کے بعد دلی چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد سنہ ۱۳۹۸ء میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں گلبرگہ چلے آئے اور بادشاہ کے مزاج اور زمانے کے رجحان کو دیکھ کر اردو میں تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ ان کی ایک کتاب معراج العاشقین چھپ چکی ہے۔ جو قدیم ترین اردو نثر کا نمونہ ہے۔ مگر تصوف اور مذہب کی اصطلاحوں سے معمور ہے۔ ایک ہدایت نامہ بھی لکھا تھا اور بہت سی نظمیں۔ راگ۔ راگنیاں اور چکی نامے منظوم کئے جو مختلف

کتب خانوں کی بیاضوں میں محفوظ ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک نظم کے چند شعر درج ہیں۔

۱۔ کھڑے کھڑے پیو جیو میں آپس میں آپ دکھا دے
ایسے میٹھے معشوق کوں کوی کیوں دیکھ پا دے
جنہ دیکھے اسے کوئی نہ بھا دے

۲۔ کل شے محیط ہے اسے کون پچھانے
جو کوئی عاشق اس پیو کے اسے جیو میں جانے
اسے دیکھت گم رہے جیسے ہیں دیوانے

۳۔ خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائے
جیو کا گھونگھٹ کھول کر پیا نکھ آپ دکھائے
راکھے سید محمد حسینی پیو سنگھ کھیا نہ جائے

خواجہ بندہ نواز کی نثر کے اس نمونے سے قدیم ترین اردو نثر کا اندازہ ہو سکے گا۔

"انسان کے بوجنے کوں پانچ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں ہو۔ پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود۔ مقام اس کا شیطان نفس اس کا اجارہ۔ یعنی واجب کی انک سوں غیر نہ دیکھنا سو حرص کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ حد نک کوں بدبوی نہ لینا سو۔ کمینہ کی شہوت کوں غیر جا گھ نہ خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کر دوا دینا۔"

عبداللہ حسینی بیرے تھے خواجہ بندہ نواز کے۔

اور دادا کی طرح صوفی اور مصنف بھی تھے۔ انھوں نے محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی کے رسالہ نشاط العشق کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اور اس کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔

۴۔ سلطان احمد شاہ ثالث المعروف بہ نظام شاہ بہمنی کے عہد میں ایک اردو شاعر نظامی بیدری گزرا ہے جو موجودہ معلومات کے لحاظ سے اردو کا وہ شاعر ہے جس نے عشق عاشقی کے موضوع پر ایک طویل مثنوی پدم راؤ لکھی۔ ورنہ اس سے قبل کی جو اردو نظم و نثر ملتی ہے وہ بالعموم مذہبی اور صوفیانہ موضوع سے متعلق ہے۔ نظام شاہ بہمنی ۱۴۶۰ء میں تخت نشین ہوا اور صرف دو سال حکومت کر کے سنہ ۱۴۶۲ء میں انتقال کیا اس سے ظاہر ہے کہ نظامی نے یہ مثنوی انہی دو سالوں کے درمیان لکھی۔ اس وقت تک بیدر اردو کا مرکز بن چکا تھا کیوں کہ فیروز شاہ کے بعد جب اس کا بھتیجا سلطان احمد شاہ ولی البہمنی تخت نشین ہوا تھا تو اس نے گلبرگہ کی جگہ بیدر کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اور اس کے جانشین اسی شہر میں آخر تک حکمراں رہے۔

نظامی کی اس مثنوی کا جو نسخہ دستیاب ہوا ہے وہ ناقص ہے لیکن بحالت موجودہ بھی اس میں ۸۶۵ شعر موجود ہیں۔ اس میں ابتدا میں حمد و نعت و منقبت صحابہ ہے اور اس کے بعد سلطان علاؤالدین ہمایوں بہمنی کی تعریف کی گئی ہے جس کے فرزند سلطان احمد شاہ کے دور میں یہ

مثنوی لکھی گئی اور جس کے لقب کی رعایت سے خود شاعر نے اپنا تخلص نظامی رکھا تھا۔ نظام شاہ کا اصل نام احمد خاں تھا۔ اور اس کو مورخین احمد شاہ ثالث کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ اس کی تعریف میں نظامی لکھتا ہے۔

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار · پرتپال سنسار کرتار ادھار
دھنی تاج کا کون راجہ اھنگ · کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ
لقب شہ علی آل احمد ولی · ولی نے بہت بدرہ نہ آگہی

اس مثنوی میں کدم راؤ اور پدم راؤ کا قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ اور جگہ جگہ شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے مثلاً

نظامی کہنہا رجس یار ہوئے · سنہار سن نغز گفتار ہوئے
کہوں سدساجے نظامی دھرم · پدم سب سنے بات بانچے کدم

مدح سلطان علاء الدین بہمنی کے عنوان سے جو اشعار لکھے ہیں ان میں سے چند بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اردو میں کسی بادشاہ کی پہلی مدح سمجھی جاتی ہے۔

بڑا شاہ وہ شاہ جس شاہ جگ · دہیں سیوتے جرم تس پائے لگ
انہیں شہ کیا شادرکھن دھرت · کسن دل دھرت دل مسخر کرن
علاروسخر ہوا لے قلم · مسخر کیا سور سے بہت علم
علم ہار کھن سور چلی سواچادُ · طبل ڈھول برغول ہدل توں بجا
چلنے لگے جب کنک بہت تبر · چرھادا کیا دھرت آکاس پر

مشتاق۔ سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (متوفی ۱۴۸۲ء) کے آخری زمانے کا ایک شاعر تھا جس نے غالباً سلطان محمود شاہ بہمنی

(متوفی سنہ ۱۵۱۸ء) کے دور میں شہرت حاصل کی۔ اس نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں جو اردو قصیدہ لکھا تھا وہ اب تک محفوظ ہے۔ یہ شاہ خلیل اللہ شاہ حبیب اللہ کے خلیفہ اور بیدر کے مشہور بزرگ خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے۔ مشتاق نے غزلیں بھی لکھیں اور قصیدے بھی جن کے عمدہ نمونے موجود ہیں اور اس لحاظ سے وہ اردو کا ایک قدیم ترین استاد سخن سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی غزلوں کے اس نمونے سے اردو کی قدیم ترین غزل گوئی کا اندازہ ہوگا۔

تجھ دیکھتے دل تو گیا ہو رہیو آ پر بے کل گھڑی !
دیکھے تو ہے جیو کے ا: پر نین دیکھے تو نین کل گھڑی
سورج کے گل میں ہیا ند جیوں یوں تجھ گلے ہیکل وسے
قربان اس کے ہات پر جن لے تری ہیکل گھڑی
آب حیات ادلب ترے جان بخش وجاں پرور ہے
مشتاق بوسے سوں پیا امرت بھری او کل گھڑی

او کسو کیسری کرتن چمن میانے چیلی ہے آ
رہے کھلنے کوں نیوں دسنی او چینے کی کلی ہے آ
سورج مرجاں میں جیوں دستا انظر دور کانپتی تھرتھر
جو لٹ پیچاں بھری سر تھے ادرخ او پر ڈھلی ہے آ
سورج کی تاب سینے جوں پگھلتا برف آپس میں
ادرخ دیکھت نظر انکھیاں کے انکھیاں میں گلی ہے آ

لطفی بھی اسی دور کا ایک شاعر تھا اور مشتاق کا ہمعصر اس نے بھی مشتاق کی طرح شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے۔ اس کی غزلیں اور قصیدے بھی محفوظ ہیں اس نے خواجوئے کرمانی کے اس مشہور قصیدے کی زمین میں بھی ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع ہے۔

قرطۂ زر چاک زد لعبت سیمیں بدن
رشک لمع نشاند شمع مرصع لگن!

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نور سمنانی کے اثر سے جو اس عہد میں بہمنی دربار میں موجود تھے خواجوئے کرمانی کا کلام بعد میں بہت مقبول اور مستند سمجھا جاتا تھا۔

لطفی کی غزل اور قصیدے کے چند شعر یہ ہیں۔

خلوت میں سجن کے میں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پہ کھڑی ہوں جلنے پر تتی ہوں
سب نس گھڑی جلوں گی جاگہ سوں نا ہلونگی
نا جل کو کیا کروں گی اول سوں متی ہوں
رسیا چتور سیلے بھو کی سوشہ محمد
مندر منے سجن کے نس جاگتی رہتی ہوں
لطفی ترے ملن کی پاکی کہاں ہے اس میں
جیوں پانچ پانڈواں کے کہنے مودھرتی ہوں

چار پہر بر قرار یو پنچ رصیا تھا سنجار
غرب کے کوئے منے ڈول ڈبایا رسن
نین سورج جھال تھے لعل بھرے سرگ کے
رین کا کاجل منگا نین میں کھینچا انجن
سرگ تھے نکلیا چندر لعل لہو کے بہتر
سور چھپایا خنجر چندر دکھایا نکھن
چندر کا بالا بچہ رین کی دائی آچا
مشک و عنبر میں چھپا جھانک کے راکھے ختن
سرگ کا طوطی ہریا مشک خطائی چڑیا
رات کا عنبر سریا صبح کی پھوٹی کرن

۷۔ فیروز بھی مشتاق اور لطفی کی طرح بیدر کا شاعر تھا اور وہیں کے ایک مشہور صوفی اور صاحب تصانیف عالم مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی سنہ ۱۵۶۴ء) کا معتقد اور مرید تھا۔ مخدوم جی اپنے والد حضرت شیخ محمد ملتانی کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ مخدوم جی اپنے عہد کے بڑے مقبول اور مشہور بزرگ تھے۔ ان کی شہرت گولکنڈہ میں بھی پہونچ گئی تھی اور ابراہیم قطب شاہ نے ان سے ملاقات کی درخواست کی جس پر انھوں نے انکار کر دیا۔ ابراہیم نے کہلا بھیجا کہ مخدوم جی تشریف نہ لاتے ہوں تو نعلین ہی بھیج دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم جی نے نعلین کی جگہ

اپنے مرید شاعر فیروز کو گولکنڈہ بھیج دیا اور چونکہ وہ بیدر کی فضائے شعر و سخن میں رنگا ہوا تھا اس لیئے گولکنڈہ میں بھی بہت چمکا اور وہاں کے نوجوان شعراء نے اس سے بہت فیض حاصل کیا۔ چنانچہ وجہی اور ابن نشاطی نے اس کو اپنا استاد لکھا ہے۔ چنانچہ اس کی وفات کے بعد ابن نشاطی کہتا ہے ؎

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد　　جو دیتے شاعری کا کچھ مرے داد

فیروز کی ایک مثنوی "توصیف نامہ میران محی الدین" موجود ہے۔ جس میں حضرت عبدالقادر جیلانی ؒ اور مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

ابراہیم مخدوم جی جیو نا !

مئے صرف وحدت صدا پیو نا

میرا پیر مخدوم جی جگ منے

منگوں نعمتاں میں صدا اس کنے

کریں مجھ اپر پیار اپے بیچ جگ

کہ تجھ پیار تے ہوئے منڈ میرو گگ

پیا جیو تھے تو ہمن ماس ہے

تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

وہی پھول جس پھول کی باس تول

وہی جیو جس جیو کی آس تول

سو توں روک ہے دین کا باردار
جو مجھ چھانوتی جگ ہے پکڑیا قرار
اچھو منجھ اُپر چھانو تیرا جرم
کہ ادھار میرا سو تیرا کرم
کریماں کی مجلس کرامت تجھے
امیناں کی صف میں امانت تجھے
سدا مست مدہوش دیدار کا
سچے توں طلب گار کرتار کا
محی الدین مخدوم جی جاگنا
ہمیں جینو اس پیو سوں لاگنا

اشرف بھی اس دور کا ایک شاعر تھا جس نے ۱۵۰۳ء میں ایک طویل مثنوی نوسرہار لکھی۔ اشرف قندھار شریف کے مشہور بزرگ سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان (متوفی ۱۴۰۳ء) کے بھانجے اور خلیفہ شاہ ضیاء الدین بیابانی کا جانشین تھا۔ نوسرہار میں اس نے امام حسین علیہ السلام کے مصائب نو ابواب اور کئی عنوانوں کے تحت بیان کئے ہیں اس موضوع پر یہ پہلی اردو کتاب ہے اور بہت ہی تفصیل اور ترتیب کے ساتھ منظوم کی گئی ہے۔ اشرف نے اپنی زبان کا نام جگہ جگہ ہندوی لکھا ہے دکنی نہیں۔ اس کی زبان اور طرز بیان کا اندازہ ان ابیات سے ہو گا۔

نا ماں کتنا بول سنوار — جا تو موتیوں کے را ہار
سونے کی چیوں کھونٹی گھڑ — مانک موتی ہیرے جڑ
ایک ایک بول پہ مانک مول — سیم ترازو دیکھتیں تول
بند بہ دئے سونے تار — سجیں ہوا تو سہار

۹۔ بہمنی دور کے ایک بہت بڑے مصنف شاہ میران جی شمس العشاق ہیں جو سنہ ۱۴۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ یہ اوائل عمر میں ترکستان چلے گئے تھے۔ اور اس وقت دکن واپس ہوئے جب بہمنیہ سلطنت کو زوال ہو رہا تھا اور اس کی جگہ دکن میں کئی نئی سلطنتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ شاہ میران جی حضرت خواجہ بندہ نوازی کے سلسلہ صوفیا میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرح اردو ہی میں تعلیم و تلقین کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی کام کیا۔ انھوں نے بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہیں شاہ میران جی کی کئی نظمیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اس وقت تک دستیاب ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام بہت مقبول تھا اور دور دور تک اس کی نقلیں پہنچ گئی ہیں۔

شاہ میران جی کی اردو تصانیف میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں

"خوش نامہ" اس نظم میں ایک نوجوان لڑکی خوش یا خوشنودی کا قصہ لکھا ہے جو شاہ پور میں صرف

سترہ سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔ وہ بھولی بھالی اور سب کی پیاری تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح شوخ و شنگ نہ تھی۔ اور بناؤ سنگھار کی جگہ خدا کی لگن لگی ہوئی تھی۔ نمونہ یہ ہے۔

توں رحمان رحیما میرا مہر محبت بھریا
میں تو باندی بروا تیری تیں مجھ ہاتھوں دھریا
نا میں کیتی بندگی تیری نا دھر کینتی یاد
دائم کیتی آگل تیرے سلکوں تھے فریاد
میں ہی میرا ناڑ چلایا کبھوں نہ ہوا اداس
آپ سندسیا توڑ گسائیں تیری منجھکوں آس

"خوش نغز" اس مثنوی میں بھی اسی دوشیزہ کا ذکر ہے اس میں وہ شاہ صاحب سے مختلف عنوانوں مثلاً عرفان و روح۔ عقل و عشق اور مراقبہ وغیرہ کے بارے میں سوالات کرتی ہے اور یہ ہر ایک کا جواب ایک نئے باب میں دیتے ہیں۔ اس طرح کل نو باب ہیں۔ نمونہ ؎

خوش پوچھے کی کہو میراں جی عالم اچھے کیتے
پیر کہیں سن جیتے تن اچھیں عالم کیتے
خوش کہی مجھ کہو میراں جی عشق بڑا یا بودہ
پیر کہیں ہیں آ کہوں بیان دھرنا اسمیں سودا

"شہادت التحقیقت،، میراں جی کی سب سے اہم اور طویل نظم ہے۔ اس میں تصوف و معرفت کے مسائل

درج ہیں۔ زبان سادہ اور سلیس ہے۔ نمونہ ؎

یہ سب عالم تیرا　　رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوئے　　نہ خالق دو جا ہوئے
جے تیرا ہو کرم　　تو ٹوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھ کو دھاؤں　　اور تیرا نام لیاؤں
ہے تیرا انت نہ پار　　کس موکھوں کروں اچار

میراں جی نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ "شرح مرغوب القلوب" ان کا لکھا ہوا ایک رسالہ نثر میں ہے جس میں دس باب ہیں۔ ہر باب کسی آیت قرآنی یا حدیث سے شروع کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ اور مختصر شرح کرتے ہیں۔ اس کا نمونہ یہ ہے۔

"پیغمبر کہے خدا کی آشنائی جے کوئی بوجھتا ہے انوکیاں توں رہکر انو تھے بوج انو تھے توں سن ہور چپ نکواچہ اس چار باتاں کا پابند ہے۔ یوں شریعت میں پہلے پاؤں رکھ کر طریقت شریعت میں پہنچ ہے۔

پیغمبر کہے جو کچھ کام کرے گا کوئی خدا کا ناؤں نالیکر نو اد کام پائمال ہو گا۔ سرا نا نوازنا خدا کوں بہت کہ او پالنہار ہے عالم کا۔"

۱۰۔ سید شہباز حسینی۔ خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے اور شاہ ہدایت اللہ حسینی کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے اپنا نام ہی بطور تخلص استعمال کیا اور خواجہ محمد حسینی کے تخلص شہباز کے آگے حسینی لگا کر اپنے تخلص میں امتیاز قائم رکھا۔ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور (۱۵۸۰ تا ۱۶۲۷ء)

خواجہ بندہ نواز کی اولاد کا بہت معتقد تھا چنانچہ شہباز حسینی کی بھی بیجاپور میں خاطر داری کی اور وہ وہیں فوت ہوئے۔ اور محلہ شاہ پیٹھ میں دفن کئے گئے۔ ان کی بعض غزلیں بعد میں خواجہ بندہ نواز کی طرف منسوب کر دی گئیں نمونہ کلام یہ ہے۔

توں توسمجھی ہے شکری کر نفس گھوڑا اسار توں
ہوئے نرم نہ تجھ او چڑے پس کھائیگا آزار توں
سیکھتے گھوڑا کھوڑ ہے بدخیال اس کا ہور ہے
تن لوٹنے کا جوڑ ہے نا چھوڑ اس بد شمار توں
جب قید گھوڑا آوے کا تجھ لامکاں لے جاوے گا
تو عشق جھگڑا پاوے گا خوش مارے تلوار توں
شہباز اپ خود کھوئے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر
اللہ کی جانب ہوئے کر تب پائے گا دیدار توں

سونے نہ دیوں خلق کوں شہبا لس دن رہے کر
سوتے سپنے پہ کوں مرے من کوئی دیکھے سوئے کر
جس رات شہ سوں نا موں اس باج جیوں میں تلملوں
اپ آہ کی اگ میں جلوں آپس بو جاؤں رد ے کر
شہباز دوجا نام نیئں جب جیو اپر لے آؤں میں
آپے لے سرتا پاؤں لگ آپس چڑاؤں دوئے کر

یہ تو بہمنی دور کے ان شعرا و مصنفین کا ذکر تھا جنھوں نے

بہمنیوں سلطنت میں رہ کر علم و ادب کی خدمت کی اور ان کی پیدا کی ہوئی علمی و ادبی فضا سے متاثر ہوئے لیکن اس زمانے میں اردو کے اور بھی ایسے شاعر اور ادیب موجود تھے جنھوں نے بہمنی حکومت کی پیدا کی ہوئی فضا سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن وہ بہمنی سلطنت میں قیام پذیر نہیں ہوئے اس لئے صحیح معنوں میں ان کا ادب بہمنی ادب نہیں کہلایا جاسکتا اس لئے ان کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ ایسے شاعروں میں دو خاص کر ذکر کے قابل ہیں۔ ایک بہاؤالدین باجن اور دوسرے شاہ علی جیو گام دھنی۔ ان دونوں نے بہمنی دور میں دکن کا سفر کیا اور یہاں کی فضا سے متاثر ہوئے لیکن یہ گجرات کے رہنے والے تھے۔ اور ان کے اردو کارنامے گجرات کے ادیبوں اور شاعروں کے سلسلہ میں شامل ہوتے ہیں۔ آخر میں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ بہمنیوں نے دکن میں علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی اچھی فضا پیدا کر دی تھی جو ان کی سلطنت کے ساتھ ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کی جانشین حکومتوں اور خاص کر بیجاپور اور گولکنڈہ میں ایسی نشو و نما پائی کہ دنیائے اردو اس پر جتنا ناز کرے کم ہے۔

عادل شاہی عہد

۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک

بہمنیوں کے زوال اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے قیام سے بہت پہلے ہی علاقۂ کرناٹک کے مرکزی شہر بیجاپور میں ایک سلطنت قائم ہوگئی اور علم و ادب کا مرکز بنتی گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کا بانی یوسف عادل شاہ (۱۴۹۰ء ۱۵۱۸ء) محمود گاواں کا تربیت یافتہ تھا اور اس نے اپنے مربی کی شہادت کے بعد ہی بہمنیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اس کے اعلان آزادی کے ساتھ وہ تمام اہل علم و فضل اس کے اطراف جمع ہوگئے جو محمود گاواں جیسے عالم و فاضل وزیر کے دست گرفتہ تھے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ خود یوسف علم و ادب کا دلدادہ اور فارسی کا اچھا شاعر تھا۔

چنانچہ اس کا کلام موجود ہے اور کلام الملوک (سلسلۂ یوسفیہ) میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اور اس کا فرزند اور جانشین اسماعیل عادل شاہ (۱۵۱۸ - ۱۵۳۴ء) دونوں اردو سے بیگانہ نہ تھے۔ اس نے اسماعیل کی تعلیم و تربیت میں اس امر کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ کسی ہندوستانی زبان سے مانوس نہ ہو سکے۔ اس لئے کہ اسماعیل کی ماں ایک مرہٹہ عورت تھی اور اندیشہ تھا کہ اسماعیل فارسی و عربی و ترکی زبانوں سے بے بہرہ نہ ہو جائے۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسماعیل کو فارسی کا تو بڑا اچھا ذوق حاصل ہو گیا لیکن مرہٹی اور اردو سے بالکل ناواقف رہا وہ بھی اپنے باپ کی طرح فارسی میں شاعری کرتا تھا۔ وفائی اس کا تخلص تھا اور اس کے فارسی کلام کے دافر نمونے موجود ہیں۔ اسماعیل کا فرزند ابراہیم عادل شاہ (۱۵۳۴-۱۵۵۷ء) بھی موروثی ذوق علم و ادب سے بہرہ مند تھا۔ وہ خود غالباً شاعر نہ تھا۔ لیکن شعراء و علماء کی قدردانی میں اپنے بزرگوں سے کم نہ تھا۔ چنانچہ جب مولانا شہیدؔ قمی گجرات سے بیجاپور آئے تو ابراہیم نے ان کی سرپرستی کا آغاز اس طرح کیا کہ ان سے کہا "جتنا زر نقد اٹھا سکتے ہو خزانے میں جا کر اٹھا لو" شہیدؔ قمی نے جواب دیا کہ "میں سفر کی وجہ سے تھکا ہوا ہوں جس دن گجرات سے چلا تھا آج سے دو چند طاقت رکھتا تھا" بادشاہ نے ہنس

کر کہا۔ تم نہیں جانتے کہ تاخیر کرنے میں آفت اور زیان کا اندیشہ ہے۔ اس لئے اسی وقت جاؤ اور دو مرتبہ جس قدر اٹھا سکتے ہو اٹھا لو"، چنانچہ شاعر نے دو مرتبہ میں پچاس ہزار ہن اٹھا لئے۔

ابراہیم کا فرزند علی عادل شاہ اس قسم کی قدردانی اور دریا دلی میں اپنے آبا و اجداد سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ ملا فتح اللہ شیرازی جیسے جید عالم کا شاگرد تھا اس کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال جمع تھے۔

اس دور کی ادبی سرگرمیاں بادشاہ کی دلچسپی کے علاوہ ان کے وزیر افضل خاں شیرازی کی فیاضی کی بھی رہین منت ہیں یہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد تھا۔ اور خود بھی عالم و فاضل تھا اس نے بیجاپور کو عالم و فاضلوں کا مرکز بنانے کی خاطر لاکھوں روپئے صرف کئے اس کے اور اس کے استاد ملا فتح اللہ کے مکان پر اکثر اوقات علمی و ادبی مجلسیں گرم ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے صاحب کمال جمع ہو کر علمی بحثیں کیا کرتے تھے اور خود بادشاہ کے روبرو دربار شاہی میں اس قسم کی مجلس روز منعقد ہوتی تھی۔ لیکن یہ تو دربار کا حال تھا۔ بازاروں اور فقیروں کی خانقاہوں میں تو اردو ہی کا دور دورہ تھا۔ بہمنی دور کے آخری شعرائے اردو شاہ میراں جی اور شہباز حسینی اس وقت بیجاپور ہی میں مقیم تھے اور ان کے مکان اور خانقاہیں اردو

کا مرکز بن گئی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے عوام اور مریدوں کی تلقین کے لئے اردو میں بہت کچھ لکھا اور ان کی اردو کتابوں کے نمونے اب تک موجود ہیں جن کا ذکر بہمنی دور کے اردو ادب کے بیان میں گزر چکا ہے۔

علی عادل شاہ کا جانشین اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰-۱۶۲۶ء) ہوا جو گولکنڈہ کے محمد علی قطب شاہ کا نہ صرف ہم عصر بلکہ کئی باتوں میں اس کا ہم ذوق و ہم مشرب تھا۔ یہ نہ صرف علم دوست اور عالموں اور صوفیوں کا قدر دان تھا بلکہ خود بھی ایک بہت بڑا صاحب کمال تھا۔ اس کے عہد میں جب مغلوں نے گجرات اور احمد نگر کی سلطنتوں کو تباہ کرنا شروع کیا تو اس نے وہاں کے تمام باکمالوں کو بیجاپور میں آجانے کی دعوت دی اور ان کے آنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دے کر اپنے آدمیوں کو ان سلطنتوں کی طرف روانہ کیا۔ اس فیاضی نے بیجاپور کو علم و فضل کی تاریخ میں زندہ جاوید بنا دیا۔ مختلف ملکوں کے شاعروں، عالموں، صوفیوں اور اولیاء اللہ کی آمد نے بیجاپور کی زندگی میں ایسی جان ڈال دی کہ یہ شہر تقریباً ایک صدی تک علوم و فنون کا مرکز بنا رہا۔

اس عہد کے مشہور صاحب کمالوں میں علامہ نورالدین ظہوری۔ مولانا ملک قمی۔ شیخ علم اللہ محدث۔ ملا رفیع الدین شیرازی۔ حکیم محمد ابوالقاسم فرشتہ اور شاہ صبغت اللہ

اور ان کے خاندان کے افسراد کا تذکرہ ہی بہت کافی ہے۔
ظہوری نے بادشاہ کی ہندی کتاب نورس کا وہ اہم دیباچہ لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے اور فارسی نثر کی ایک بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ رفیع الدین شیرازی نے ۱۶۰۸ء میں سلاطین بیجاپور کی اہم تاریخ تذکرۃ الملوک لکھی۔ محمد قاسم فرشتہ نے ابراہیم عادل شاہی کے حکم سے سنہ ۱۶۰۰ء میں ممالک ہند کی بے مثل تاریخ لکھی۔ جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ ملک قمی نے مخزنِ اسرار نظامی کے جواب میں ایک مثنوی لکھی اور اس کے صلہ میں ہا زسشتر زر طلا حاصل کیا۔ ابراہیم اپنے ہمعصروں اکبر اور محمد قلی کی طرح ہندوستانیت کا دلدادہ تھا۔ ہندی لباس۔ زبان اور طرز معاشرت سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور ہندی موسیقی کا تو خود بھی ماہر کامل تھا اس کی سرپرستی کا شہرہ سن کر شمالی ہند اور خاص کر بنارس کے بڑے بڑے ماہران موسیقی اس کے دربار میں جمع ہوگئے تھے۔ اس نے خود اس موضوع پر ہندی میں ایک مشہور کتاب نورس لکھی جس کے دیباچۂ فارسی کا تذکرہ گذر چکا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ کی نورس چھپ چکی ہے۔ یہ پوری کتاب اگرچہ دکنی میں نہیں ہے۔ لیکن بعض راگ اور راگنیاں دکنی میں بھی ہیں اور ظاہر کرتی ہیں کہ کلاسیکل موسیقی کے لئے

بھی اسی زمانے میں دکنی بول استعمال کئے گئے۔ ابراہیم کی زبان موسیقی کی اصطلاحوں اور بحروں اور اس زمانے میں موسیقی کے لئے جو لفظی خزانہ رائج تھا اس سے معمور ہے۔ اس لئے عام دکنی کتابوں اور نظموں سے مختلف نظر آتی ہے۔ اس کی بحریں بھی عام دکنی کتابوں کی بحروں سے الگ ہیں۔ اس میں خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز کی مدح کے چند شعر یہ ہیں۔

سید محمد پتی میرا جیوں رتن میں اُتم ہیرا
محل محل صدر سنوارے اس تمو نے بہشت اپارے
انند ہوتا ہے صدا بہارے ارتی لیائے انبر بھرتا رے
کدم کستوری جو چندن للے بادل کالے ہور نگ برسائے

اسی زمانے میں بیجاپور میں ایک بہت بڑے ادیب اور شاعر شاہ برہان الدین جانم (سنہ ۱۵۴۳-۱۵۹۱ء) موجود تھے جو شاہ میراں جی کے فرزند اور خلیفہ تھے اور اپنے باپ کے کام رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں منہمک تھے۔ وہ خود بھی بہت بڑے صوفی اور شاعر تھے ان کی کتابیں اب تک موجود ہیں۔ ان کا کلام بہت مقبول ہوا اور اب بھی ہندوستان میں دور دور اس کے نسخے ملتے ہیں۔ ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔

ارشاد نامہ:۔ ڈھائی ہزار ابیات کی طویل مثنوی ہے۔ جو شائع ہو چکی ہے۔ اس میں حمد و نعت کے بعد اپنے پیر د

مرشد اور والد شاہ میراں جی کی مدح لکھی ہے اور پھر تصوف کے مضامین منظوم کئے ہیں۔ شاہ میراں جی کی مدح میں لکھتے ہیں

صفت کروں کچھ اپنا پیر　　جس تھے روشن ہوئے ضمیر
دھوں جگ میں محبت وہی　　سمروں لے من نیت وہی
تس کوں سمریں تن من شاد　　جس کا اہے منجھ پر ساد
جگ میں اہے توں ہی رتن　　ہردے میں لے کروں جتن
راکھیا کو دن کو اس ٹھاؤں　　تل تل سمروں لے اس ناؤں
پیر میراں جی شمس عشاق　　دھوں جگ رب تجھ کیا کشاف

سکھ سہیلا :- ایک ترکیب بند ہے جس کا ہر بند چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ جن میں آخری مصرع مشترک ہے۔ اس نظم میں مرشد کے استفادہ اور معرفت و سلوک کے صحیح طریقوں کی تلقین کی ہے۔ یہ نظم بھی ڈاکٹر حفیظ سید کی ادارت اور شرح کے ساتھ چھپ گئی ہے۔ اس کا پہلا اور آخری بند یہ ہے۔

بھو دھات یوگی کریں بچار گربن نہ پادیں موئے
سادھو جن کی سیوا لیویں تو جیہ پراپت ہوئے
گر پر سادھو کوئی یک جانے دیکھت بر لا کوئے
لوکا یہ مت کچھ الا دھی جن بوجہ بختوں لا دھی
سکھ کا سرور شاہ میراں جی انت کرں لے مانے
سہسر تیوا ہوئے مکھ میرے نہ پوری کرت بکھانے

آکہیں جانم سوک سہیلا چا کھیا ہوئے سو جانے
لوکا یہ مت پچھ الادھی جن بوجھ پختو ں لادھی

ان کے علاوہ جانم کی دوسری اردو نظموں کے نام یہ ہیں،
بشارت الذکر۔ منفعت الایمان۔ وصیت الہادی۔ نکتۂ واحد
رموز الواصلین وغیرہ۔ انھوں نے دوہرے بھی لکھے تھے۔
اور ان کی زبان پر برج بھاشا کا اثر بہت نمایاں ہے۔

اسی دور کا ایک شاعر عبدل بھی تھا جس نے
۱۶۰۳ء میں اپنے محسن ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے حالات
ایک طویل اردو مثنوی ابراہیم نامہ میں قلم بند کئے ہیں یہ
مثنوی حمد۔ نعت۔ مدح یاران رسول۔ تعریف مرشد سید محمد حسینی
گیسو دراز سے شروع کی گئی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ کے
بلا بھیجنے اور یہ حکم دینے کا حال لکھا ہے کہ "نئے مضمون کی
ایک ایسی کتاب لکھ کہ جس کا جواب کسی سے نہ بن پڑے"
عبدل نے دریافت کیا کہ "کس زبان میں لکھوں کیوں کہ
میں سوائے ہندوی اور دہلوی کے کوئی اور زبان عرب وعجم
نہیں جانتا" بادشاہ نے جواب دیا کہ جس زبان میں چاہے لکھو
فن شعر کی خوبیاں اور عشق کے اسرار تو ہر زبان میں ملحوظ
رہتے ہیں۔ اور پرکھنے والے جوہر کو خواہ وہ کسی رنگ وروپ
میں ہو پرکھ لیتے ہیں" اس کتاب میں حسب ذیل عنوان
قابلِ ذکر ہیں۔
شہر بیجاپور۔ عرابہ و حصار محل۔ ماہران رقص و موسیقی

دربار بادشاہ۔ نورس۔ مجلس شاہ عالم پناہ۔ شکار۔ ہیبت لشکر۔ شاہی ہاتھی۔ شاہی گھوڑے۔ سلحداران شاہی باغ شاہی وغیرہ۔

عبدل کی زبان میں بھی ہندی کا اثر زیادہ ہے۔اس کے چند شعر بطور نمونہ درج ہیں۔

ادہی شاہ استاد کر سونظر — بلایا جو عبدل کوں سر ہاتھ دھر
نوی بات مضمون کر اک کتاب — نہ کوئی فکر کو نہ دسیا ہے نس کا جواب
نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشاں — اگر کچھ رہے ہے تو بچن شعر جاں
سو یوں بچن سن شاہ استاد ہیں — پوچھیا جگت گر شعر کہہ کس زباں
زبان ہندوی مجھ سوں ہور دہلوی — نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

حکیم اتشی بھی اس دور کا بڑا فارسی اور اردو کا شاعر تھا۔ اس کا تعلق شیراز کے ایک معزز خاندان سے تھا وہ ابراہیم عادل شاہ کا شاہی طبیب تھا۔ اور محل میں اس کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ اس کی اردو شاعری کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

ابراہیم عادل شاہ کے دور میں اور بھی کئی اردو کے شاعر گذرے ہیں۔ جن میں سے اکثروں کے نام اور کام ابھی منظر عام پر نہیں آئے اور بعضوں نے اس کے فرزند محمد عادل شاہ کے دور میں شہرت حاصل کی جن کا ذکر آگے آئے گا۔

محمد عادل شاہ (۱۶۲۶-۱۶۵۶ء) نے اپنے باپ کو

پیدا کی ہوئی علمی و ادبی فضا سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ خود تو غالباً شاعر نہیں تھا لیکن اس کا دربار اور پایۂ تخت شاعروں ادیبوں اور فن کاروں سے بھرا ہوا تھا اس کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو گولکنڈہ کے محمد قطب شاہ کی دختر تھی اور اس کا بچپن وہاں کی فضا میں گزرا تھا۔ اور جب وہ شادی کے بعد بیجاپور آئی تو اس کے ساتھ گولکنڈہ سے جو غلام روانہ کئے گئے تھے۔ ان میں بعض نے بیجاپور میں شاعر کی حیثیت سے شہرت اور عزت حاصل کی۔ اس نے بیجاپور میں ادبی مقابلے منعقد کئے۔ چنانچہ ایک بار اعلان کیا کہ جو بھی نادرنامہ فارسی کا اردو میں ترجمہ کرکے لائے گا اس کو بیش بہا انعام دیا جائے گا۔ اور وہ بہترین شاعر سمجھا جائے گا

محمد عادل شاہ اور خدیجہ سلطان کی ان اردو نوازیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہد میں بہت زیادہ اردو کتابیں لکھی گئیں اور بیجاپور اردو کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اس عہد کی حسب ذیل شاعروں کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔

قطب رازی - بیدر کے ایک بزرگ شاہ ابوالحسن قادری کا معتقد تھا۔ جو حضرت محبوب سبحانی کی اولاد میں تھے۔ اور ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آئے تھے۔ بادشاہ نے ان کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور بیجاپور کے عوام ان کے بیحد معتقد ہو گئے تھے۔ رازی

نے ان کی بڑی تعریف کی ہے اور انہیں کی فرمائش پر سید راحو حسینی کے فارسی قصیدے تحفۃ النصائح کا اسی نام سے سنہ ۱۶۳۵ء میں اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس میں ۸۶۷ شعر ہیں اور ۴۵ باب۔ اس کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

تحفہ اصل اے فارسی سب ترجمہ دکنی کیا
صاحب سود نیا دین کہ شہ بوالحسن فرمائے پر
بندیاں میں سب کترا ہے رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکنی زبان شہ کی رضا لے سیس پر
بندہ تو سب پر عیب ہے جو شاہ بخشے عیب توں
بندہ نوازی شاہ سوں او عیب ہووے سب ہنر
ہجرت سے دس سو سال ہور چالیس پر بھی پانچ تھے
تب لے مرتب سو ہوا تحفہ سود کھنی نامور

مرزا محمد مقیم مقیمی استرآبادی۔ ایران سے ابراہیم عادل شاہ کی شہرت سن کر بیجاپور آیا تھا۔ اور فارسی کا بڑا اچھا شاعر تھا۔ بیجاپور کی اردو نوازی سے متاثر ہو کر سنہ ۱۶۳۸ء میں ایک اردو مثنوی چندر بدن و ماہیا لکھی ہے جس میں ایک ہندو شہزادی چندر بدن اور مسلمان تاجر زادہ محی الدین (مہیار) کے عشق کی داستان بیان کی ہے سبب تالیف میں گولکنڈہ کے غواصی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیوں کہ وہ

اس مثنوی کی تالیف کے دو تین سال بعد بیجاپور میں بحیثیت سفیر آیا تھا اور یہاں بحیثیت شاعر بھی اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی تھی۔ سبب تالیف کے چند شعر یہ ہیں :-

تعمہ منتجھ پرت کا کہا ایک ات | جو سبرے تو لیلی و مجنون کون سن
ہوا دل پر یوں کر تفکر قریب | کہوں شعر موزوں حکایت عجیب
بچن در ہو دل تے ابلنے لگے | نوے طرز خوش تب نکلنے لگے
منتبع غواصی کا باندیا ہوں میں | سخن مختصر لاکے ساندیا ہوں میں

دلے ہیں اپس کوں سراپا نہیں
شعر میں کسی کا پھر ایا نہیں

مقیمی کا ایک ہم عصر امینؔ بھی تھا جس نے اس کی مثنوی چندر بدن و مہیار کو دیکھ کر ایک مثنوی بہرام و بانو حسن لکھی تھی۔ جس میں اپنے مرشد شاہ عالم کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ یہ مثنوی مکمل نہ کر سکا۔ بلکہ اس دور کے ایک اور شاعر مرزا دولت شاہ نے اس کی تکمیل کی۔ دولت دراصل فارسی کا بلند پایہ شاعر تھا اس نے سنہ ۱۶۳۸ء میں امین کی اس مثنوی کی تکمیل کی۔

مثنوی بہرام و بانو حسن میں شادی کا جو سماں پیش کیا گیا ہے اس کے چند شعر بطور نمونہ درج ہیں۔ جن سے اس کی زبان اور اسلوب کا اندازہ ہو سکے گا۔

کیا فرش زریں سو ہر ٹھار پر | بنائے محل سارے گلزار پر
بچھے قالیناں بیچ ایوان کے | دھرے تکیے مخملی بڑی شان کے

بہوت بھانت سوں سارے بسن کیا   جواہر کے راسوں سوں زینت کیا
کیا آب پاشی وہاں ہر زماں   صبح و شام چھڑکا ہوئے بے گماں
تھے چھتیس باجے اسی ٹھار پر
بجا نہار موجود تھے کار گر

مرزا دولت شاہ نے غزلیں بھی لکھی تھیں۔ ایک غزل کے چند شعر یہاں اس لئے درج ہیں کہ بیجا پور کی اس سے پہلے کی عشقیہ غزلیں نہیں ملی ہیں۔

لذت لذیذ نرل صورت جمال حلوا
گوری کا رنگ لب ہے جیو کا اولال حلوا
شرنی فروش سارے حیراں رہے بچارے
دیکھ سدا ہیں لبارے تجھ نرم گال حلوا
عاشق کوں موں ہلک کر بولے سو شاہ دولت
تجھ لب تے توں ذرا دے مجھ کوں اتال حلوا

ظہورؒ ابن ظہوری ترشیزی بھی اس دور میں اردو کا شاعر تھا۔ اس کے باپ ظہوری نے ۱۵۸۰ء میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار میں رسائی حاصل کی تھی اور نورس کا دیباچہ لکھا تھا۔ ظہور نے بیجا پور کی اردو نواز فضا میں پرورش پائی اور اردو شعر و سخن کے ذوق سے بہرہ ور ہو کر غزلیں لکھی تھیں۔ اس کی غزلوں کا نمونہ یہ ہے

جوبن سنین سج کر گج مست ہو چلی ہے
لنگر سو پینیاں ہو گھونگراں کی کھلبلی ہے

دو تین تیرے راوت میلا کریں پرم کا
سرکاٹ عاشقاں کا نن سوں جدا کری ہے
اے شوخ ہات غافل یر ہا کھڑا ہے مشکل
بختل ظہو رسوں مل یو جان دلبیری ہے

حسن شوقی[۱۲] بھی اس دور میں بیجاپور میں مقیم تھا اور یہیں سے بعد کو گولکنڈہ روانہ ہوا تھا وہ اصل میں ایک جہاں گشت شاعر تھا۔ پہلے احمد نگر میں رہا اور وہاں ایک مثنوی "فتح نامۂ نظام شاہ" لکھ کر شہرت حاصل کی۔ بیجاپور میں اس نے عادل شاہ کی شادی کی دعوت کا تفصیلی حال ایک مثنوی "میزبانی نامہ عادل شاہ" میں لکھا ہے۔ وہ غزلیں بھی اعلیٰ پایہ کی لکھتا تھا اور بلند مرتبہ شاعر تھا۔ اس کی غزلوں کا نمونہ درج ذیل ہے۔

تجھ مکھ کنول کو لے بدل جگ میں سرنگ لالہ ہوا
تجھ زلف تھے اپچا بھور دو جا بھونک کالا ہوا
تجھ نین نے نرگس کھلے عبہر کھلے بن کر کھلے
تجھ خوئے تے دونا ہوا مروا ہوا بالا ہوا
شوقی ہماری برہ کے راسیاں کوں جیو جھو کا فلک
پاسنگ تس میزان کا گاویل نرنالا ہوا

جنے تجھ برہ پاد کھ میں جہنم کا جنسم پکڑے
انو لے حوض کوثر تے کدھیں یک پل نہ نم پکڑے

عجب کیا ہے جو پاوے تو اثر تیرے دہن کا کچھ
بقا توشہ فنا کا لے اگر راہ عدم پکڑے
ہمارے حال پر شوقیؔ بجز حق کوئی واقف نین
کرا ماً کا تبین مسکیں رہے حیران قلم پکڑے

محمد ابراہیم صنعتیؔ نے حضرت تمیم انصاری کا واقعہ "قدرت بے نظیر" کے نام سے اسی زمانے میں ۱۶۴۵ء میں منظوم کیا تھا۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ صنعتی کی نشو ونما اگرچہ عہد ابراہیم میں ہوئی تھی مگر اس نے اس دور میں شہرت حاصل کی۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھا اور برجستہ تشبیہوں کی وجہ سے اس کی یہ مثنوی شہرت رکھتی ہے۔ اس عہد میں سمندری سفر کس طرح کیا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل بھی اس نے اپنی مثنوی میں بیان کی ہے۔ اس موقع کے چند شعر یہ ہیں۔

سبک سیر تھا اس گراں بار ساتھ
چلے جاں کہے منہ میں کی منہ میں بات
کہے دیکھ کشتی کوں توں سر بسر
کہ یک شہر چلتا ہے پانی اُپر
اوک جلد تھا اگرچہ بے پائے تھا
سو بے پائے نت آب پیمائے تھا
اگر بیگ جانے کا ہم آ پڑے

وہم ساتھ کشتی او کشتی کرے
پھریں جہاز اوحوں زنِ باردار
سو یک پیٹ میں اس طفل کئی ہزار

کمال خاں رستمی[۱] بیٹا تھا اسمعیل خطاط خاں کا جو بیجاپور کے شاہی دربار میں چھ پشت سے خوشنویسوں کے زمرے میں ملازم تھا۔ رستمی ایک ٹھیٹ بیجاپوری شاعر تھا اور اس نے قصیدہ، غزلیں، مثنویاں جملہ اصناف سخن میں کمال حاصل کیا تھا اور اردو نثر بھی لکھی تھی۔ خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم کے اعلان انعام پر اس نے "فارسی خاورنامہ" ابن حسام کا عمدہ اردو ترجمہ ۱۶۴۹ء میں کیا تھا۔ یہ فردوسی کے شاہنامے کی طرز پر ایک طویل مثنوی ہے۔ جس میں حضرت علی کی لڑائیاں بیان کی گئی ہیں۔ رستمی کا خاورنامہ اردو کی طویل ترین مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے چوبیس ہزار ابیات لکھی ہیں اور یہ پوری مثنوی اس نے ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل کی۔ ابتدائی حصہ میں مختلف عنوانات پر اپنی استادیِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ واقعی ایک بڑا شاعر تھا اور اسی لئے اس کی یہ کوشش فارسی خاورنامہ کے دوسرے تمام اردو ترجموں پر سبقت لے گئی اور وہ ملکہ خدیجہ سلطان کی نظر میں انعامی مقابلہ میں اول قرار پایا۔ اس کے سبب تالیف کے چند اشعار بطور نمونہ یہاں

درج ہیں -

ملک کوں وفاداری اندیشہ نیں
بغیر از جفا اسکوں کچھ پیشہ نیں

اتی خوب یو زندگی ہور ہوس
اگر مرگ کا ڈر نہ ہوتا دپس

اجل سرات کوئی جیو چھپا یا نہیں
اپس درد کوں دارو دکھا یا نہیں

بچھا نا بھی کوئی یاں بچھا یا نہیں
جو اس پہ اجل ہت پھرا یا نہیں

دنیا میں یہی رسم معتاد ہے
اسی رسم پر آدمی شاد ہے

یہ بہتر وہی ہے کہ جوں رداستاں
سوا روں اپس دل میں تھے داستاں

اسی نامہ سوں نام مجھ ہوئے بلند
ہوئے خلق بھی اس سے بہرہ مند

ملک[۱۵] خوشنود بھی ان شاعروں میں سے تھا جنھوں نے ملکہ خدیجہ سلطان کے انعامی مقابلے میں حصہ لیا اور اول آیا - یہ اصل میں گولکنڈہ کا غلام تھا جو خدیجہ سلطان کے جہیز میں شہزادی کے ساتھ گولکنڈہ سے بیجا پور کو گیا تھا - خدیجہ سلطان دوران سفر میں اس کے حسنِ انتظام

اور وفاداری سے اتنی خوش ہوئی کہ بیجاپور میں اپنے محل کی خدمت سپرد کی۔ خوشنود نے بیجاپور میں شاعر کی حیثیت سے اپنی جگہ پیدا کرلی اور دربار میں اتنی اہمیت پائی کہ سنہ ۱۶۳۵ء میں بیجاپور کا سفیر بناکر گولکنڈہ روانہ کیا گیا اور گولکنڈہ میں وہاں کے اس سابق غلام کی ایسی قدر کی گئی کہ کسی سفیر کا ایسا شاندار استقبال نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ شاہی محل کے عہدہ دار شہر سے باہر آکر اس کا خیر مقدم کرکے اس کو شہر میں لے گئے۔ ملک خوشنود نے دربار میں پہونچ کر سلطان عبداللہ کی تعریف میں ایک ایسا قصیدہ پڑھا کہ بادشاہ پھڑک گیا اور خلعت اور انعام سے سرفراز کرکے ایک عظیم الشان عمارت میں اس کی بود و باش کا انتظام کیا اور ہر بار یابی کے وقت بیش بہا تحائف سے سرفراز کیا۔ جب خوشنود بیجاپور واپس ہونے لگا تو گولکنڈہ کے درباری شاعر ملا غواصی کو اس کی مشایعت کے لئے بیجاپور تک روانہ کیا۔

ملک خوشنود نے متعدد قصیدے اور غزلیں لکھیں امیر خسرو کی فارسی مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں یوسف زلیخا، بازارِ حسن اور ہشت بہشت بہت مشہور ہوئیں۔ ہشت بہشت محمد عادل شاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ اس کا اسلوب بیان بہت ہی سلیس ہے۔ دنیا کی بیوفائی سے متعلق اس نے جو خیالات ظاہر کئے

ہیں ان کے چند شعر یہ ہیں۔

عجب بے مہر دنیا بیوفا ہے — محبت عین اس کا سب جفا ہے
جتے ہیں دوستاں فرزند ساتی — سکل ہیں گور لگ اوسب سنگاتی
ملے ہیں باپ بھائی سب مراتی — ولے کوئی گور میں ہرگز نہ آسی
کہاں دارا سکندر شہ کیانی — کہاں جمشید جم حاتم دورانی
کہاں خسرو کہاں اور ستم وزال — سینا نوشیرواں کا کیا ہوا حال

چلے جوں نیک مرداں چل تو خوشنود
خدا حاصل کریں گا دل کا مقصود

محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۶۵۶ - ۱۶۷۳ء) تخت نشین ہوا یہ بادشاہ خود بھی اردو کا بہت بڑا اور اچھا شاعر تھا اور اپنے باپ اور دادا کی طرح ان کا سرپرست اور مربی تھا۔ اس کا مکمل اردو دیوان موجود ہے۔ علی عادل شاہ کا تخلص شاہی تھا۔ اس نے غزلیں۔ قصیدے۔ مثنویاں سب لکھی ہیں اور اپنے دادا ابراہیم کی طرح موسیقی کی راگ راگنیاں بھی منظوم کی ہیں۔ اس کے کلام میں سوز وگداز بھی ہے۔ اور رعنائی بھی اس کی عمر کا بیشتر حصہ مغلوں سے معرکہ آرائی اور پریشانی میں گزرا۔ اور شاید اس لئے بھی اس کے کلام میں تڑپ اور بےچینی پائی جاتی ہے۔ یاقوت اور مرجان کی بدکھ کے بارے میں اس کی بہ حسب ذیل غزل بہت دلچسپ ہے۔

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو
یا قوت ہور مرجان میں کو ہے رتن برتر کہو
بولے جہاں کے پارکھی ہمنا نہ آوے بولنا
تمنا سہاتا بولنا لے شاہ بحر و بر کہو
بولیا ہوں نت میں فکر تے یوں دو رتن کا فرق کر
گر کچھ اچھے انصاف تو اس بول کوں خوشتر کہو
مرجان میں ساتی نہیں یاقوت میں صافی اچھے!
جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کوں بہتر کہو
یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل
سن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

اس نے بہت سے گیت بھی لکھے ہیں۔ جو سوز و گداز اور تڑپ سے معمور ہیں۔ اس گیت کے دو بند یہ ہیں۔

کوئی جا دکھو مج ساجن سات　　بیں نیہ بندی توں کیتا گھات
دل میرا اپنے سات کیا
مج برہے میں دن رات کیا
دلداری کا ناباب کیا
سب بسرا سکھ بہات کیا
کئی مج سوں ایسا گھات کیا
کوئی جا دکھو مج ساجن سات　　بیں نیہ بندی توکیتاں گھات
تجھ یاد منیں تلملتی ہوں
لہو تیل منے دل تلتی ہوں

تن موم بتی ہو جلتی ہوں
اس جلنے سے نا ٹلتی ہوں
سب رین برہ میں گلتی ہوں
کوئی جاؤ کہو پیو ساجن سات　　 بن پیہ بندی تو کیناں گھات

علی عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعراء ملا نصرتی اردو کا ایک بہت بڑا شاعر تھا۔ اس کے حالات زندگی اور کلام پر مولوی عبدالحق صاحب نے ایک مبسوط کتاب مرتب کر کے چھپوائی ہے۔ اور اس کی مثنویاں گلشنِ عشق اور علی نامہ بھی شائع ہو چکی ہے وہ رزمیہ اور بزمیہ دونوں قسم کی شاعری کا استاد تھا۔ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اور قصیدے بھی۔ خاص کر قصیدہ نگاری میں دکن کا کوئی اس کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ نصرتی بیجاپور کا ایک موروثی سلحدار تھا اور کئی پشتوں سے حضرت خواجہ بندہ نواز کے سلسلے میں مرید تھا ان باتوں پر اس نے اپنی کتابوں میں بڑا فخر کیا ہے وہ علی عادل شاہ کا بچپن کا ساتھی اور مقرب تھا اور اس زمانے کے رواج کے مطابق خود کو بادشاہ کا شاگرد ظاہر کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ کے استاد بھی خود کو شاگرد بادشاہ کا ظاہر کرتے ہیں اور بادشاہ کو اپنا استاد لکھا کرتے تھے۔

نصرتی کو بیجاپوری دربار میں وہ عزت اور مرتبہ حاصل تھا جو کسی اور دکنی شاعر کو کسی جگہ حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت

علی عادل شاہ کے ساتھ رہتا اور رزم و بزم دونوں میں اس کا شریک تھا۔ اس نے علی عادل شاہ کے صرف دو سال بعد ہی سنہ ۱۶۷۵ء میں وفات پائی اس نے سنہ ۱۶۵۷ء میں ایک رزمیہ مثنوی گلشنِ عشق لکھی۔ جس میں کنور منوہر اور مدمالتی کی عشقیہ داستان قلم بند کی گئی ہے۔ سنہ ۱۶۶۵ء میں ایک رزمیہ مثنوی علی نامہ لکھی جس میں علی عادل کی داستان رزم بزم قلم بند کی ہے اور دراصل اسی کتاب سے اس کی استادی اور صاحب کمالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی غزلوں کے ایک مجموعہ گلدستہ عشق کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس کی چوتھی کتاب "تاریخ اسکندری" علی عادل شاہ کی وفات کے بعد مرتب ہوئی تھی اور علی کے جانشین سکندر عادل شاہ سے منسوب ہے۔

نصرتی کے قصیدے۔ مثنوی اور غزل کا مختصر سا نمونہ یہ ہے علی عادل شاہ کی مدح میں لکھتا ہے۔

جب نے جھلک دیکھیا اوک سورج تری تروار کا
تب تے لگیا تھر کانپنے ہو پر عرق یک بار کا
کوئی بندجو تیری کھرگ کے پانی کی دریا میں پڑے
کھا جوش اوک بک نیر ہوئے تختہ الکھنڈ اگار کا
کس میں تو طالع کے قوی جم تے اوک جم جم دسے
جس میں تو عالمگیر ہوا یا سکندر سار کا
کوئی مہرۂ سر تج اگے جا نبا زنیئں لے جاسکے

جاں رزم کے تختے پو توں ششدر بند یا پھل بارکا
ہر فصل شہ کے وصف کی لکھتا تو ہوتے کئی ورق
پڑتا ہوں سرنامہ بڑی یک فتح کی طومانہ کا

مغل فوجوں کے حملہ دکن کا منظر مثنوی میں اس طرح کھینچا ہے۔

کہتا ہوں اتا فوج دہلی کی بات ۔۔۔ چلی تھی دکن دل پہ کس دھات سات
کہ جس فوج کوں دیکھنے ہیں سمج ۔۔۔ دسے ناکسے انتہا ہور او پچ
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل ۔۔۔ انھا جس میں سردار اصحاب فیل
سراسر اگر بھار سارا دسے ۔۔۔ تو یک افو جدا رس میں دارا دسے
سبک منصبی ہور بھاری کتے ۔۔۔ اٹھے کئی صدی ہور ہزاری کتے
یک یک ملک کے نام آور جواں ۔۔۔ دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں
مغوناں کتنے ملک و کئی شہر کے ۔۔۔ کتنے ہندو کئی ماورالنہر کے

غزل کا نمونہ یہ ہے۔

کرتا ہے ماہ نو کو سپورن کر آفتاب
نو آرسی کو ہاتھ پکڑ اور کر آفتاب
تج حسن کا جھلک جو پڑے زنگبار پر
ہر حاملہ وہاں کی جنے دختر آفتاب

مغرور بے خبر ہے مد سوں مدن کی مالی
عالم کا جیو لینے لوچن میں ہے سوالی
اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں

دینے کو وصل کا پھل پینے کو جیو انانی
برھے کی نس میں غم سوں جلتا ہوں شمع نمنے
دکھلا ضیا درس کا اے قادرِ جہانی

اس کے دور کے ایک غیر درباری شاعر شاہ ملک[۱۵]
کا ذکر بھی ضروری ہے۔ بیجاپور میں شاہی حلقہ کے علاوہ
میراں جی اور بیدر کے صوفیوں اور مشائخوں کے
زیرِ اثر تصنیف و تالیف کے کئی حلقے قائم تھے اور ترقی
کر رہے تھے۔
اسی حلقہ کے ایک شاعر شاہ ملک تھے جنہوں نے
۱۶۶۶ء میں ایک مذہبی مثنوی شریعت نامہ لکھی تھی جو احکام
الصلوٰۃ کے نام سے بھی مشہور رہے۔
انہی مذہبی حلقوں میں شاہ امین[۱۶] الدین اعلیٰ (۱۵۹۱ء-
۱۶۷۵ء) اس عہد کے سب سے بڑے صوفی اور بزرگ
مانے جاتے تھے۔ وہ شاہ برہان الدین جانم کے فرزند اور
ان کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ اپنے باپ اور دادا
شاہ میراں کی طرح رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف
کے کام کو جاری رکھا۔ ان کے خلیفہ اور شاگرد بعد کو تمام
دکن میں پھیل گئے تھے۔ اور اس طرح شاہ میراں جی کا
فیض دور دور جا پہونچا اور اب تک اس سلسلے کے بزرگ
موجود ہیں اور صوفیانہ کلام لکھتے ہیں۔

شاہ امین ایک فطری شاعر تھے اور بہت سی مثنویاں اور قصیدے اور ترکیب بند اور گیت لکھے تھے نیز بھی کئی رسالے مثلاً گفتار شاہ امین اور گنج مخفی وغیرہ ان سے منسوب ہیں۔ سنہ ۱۶۷۵ء میں فوت ہوئے۔ یہ ان کی نثر کا نمونہ ہے۔

"بوج اے طالب تحقیق اس لاہوت کے
مقام میں اگر واصل ہوا تو اس کوں حال
آئے گی۔ سو تجلی بھانت بھانت کی روش
ہے۔ اس کے تئیں اس کی استعداد کے
مناسب حاصل ہووے گا یعنی ازل کے
موافق حاصل ہووے گا۔"

مثنوی کا نمونہ یہ ہے۔

ادنی عاشق اعلی بوج
یہ دو مقصود آکھوں تج

عاشق ادنی جوں پتنگ
اعلی موم بتی کا رنگ

جوں پتنگا دیکھ بنا
آپ جل کر ہوئے فنا

دلے ولایت جیوں پتنگ
موم بتی ہے نبوت رنگ

یہ سب بوجھے اسکا رموز
بوجھے مجلس شب اور روز

۲۰۔ **سید میران ہاشمی** ایک مادرزاد اندھے شاعر جو اسی حلقۂ صوفیہ کے ایک بزرگ شاہ ہاشم علوی کے معتقد تھے۔ انھوں نے مثنویوں اور مرثیوں کے علاوہ

ریختی میں ایک پورا دیوان مرتب کیا تھا۔ جو سلسلۂ یوسفیہ کی طرف سے چھپ رہا ہے۔ انھوں نے سنہ ۱۶۸۷ء میں مثنوی یوسف زلیخا کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ اس مثنوی کے بھی کئی نسخے موجود ہیں۔ چونکہ ہاشمی نے ریختی میں کمال حاصل کیا تھا۔ اس لئے اس کا نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ اس صنف سخن کی اولین کوشش ہے۔

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتیاں کا پرونے ہار بیٹھوں گی
انو یہاں آؤ کہیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
اٹھلتی ہور مٹھلتی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی
ترک میں ان کے جانے کو خوشی سوں شاد ہوں دل میں
ولے لوگاں میں دکھلانے کوں ہو بیزار بیٹھوں گی
بلایاں جیو کا ہے یں پڑوں گی پاؤں دل سوں میں
وے ظاہر میں دکھلانے کوں ہو اغیار بیٹھوں گی
کروں گی نا ہرا چپ غصہ ہور مان ہٹ لیکن
سر سجن پر تے جیوا پنا یہ جیو میں وار بیٹھوں گی
کنے کو چپ کنی ہوں میں ولے میں دل میں گھٹ کی ہوں
ترک ہو ہاشمی سوں مل کر آٹھوں پہار بیٹھوں گی

محمد امین ایاغی ایک مذہبی شاعر تھا اور علی عادل شاہ کا مداح۔ اس نے ایک مثنوی نجات نامہ سنہ ۱۶۶۹ء

میں لکھی تھی۔ جو شائع ہو چکی ہے اور پند و نصائح سے معمور ہے

شغلی[۲۲] بھی اسی زمانے کا شاعر تھا اور اس نے بھی ایاغی کی طرح ایک مذہبی مثنوی "پند نامہ" لکھی تھی۔ جو موجود ہے اور اس کے کلام کے نمونے شائع ہو چکے ہیں۔

سیوا[۲۳] نے ۱۶۸۰ء میں فارسی روضتہ الشہدا کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا لیکن یہ مثنوی اب نایاب ہے۔ وہ گلبرگہ کا باشندہ تھا اور علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آگیا تھا۔ اس نے مرثیے بھی لکھے تھے۔

اسی طرح کا ایک مذہبی شاعر علی[۲۴] بھی تھا جس نے ایک مثنوی "پند دلبند" لکھی تھی جو موجود ہے اور نمونۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔

عبدالکریم کریم[۲۵] بھی اسی دور کا شاعر اور شاہ میراں جی کے حلقہ ارادت میں شامل تھا اور ان کی طرز کی نظمیں اور گیت لکھا کرتا تھا۔ ان کی مدح میں بھی نظمیں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر تصوف کے مضامین باندھے ہیں۔

اسی طرح شاعروں میں مومن[۲۶] مرتضیٰ[۲۷] حسینی[۲۸] اور مختار[۲۹] قابل ذکر ہیں۔ یہ سب مذہبی موضوعوں پر لکھتے تھے۔ مومن چینا پٹن کا باشندہ تھا۔ سنہ ۱۶۸۲ء میں سید محمد جون پوری کی حیات اور تعلیمات پر ایک مثنوی اسرار عشق لکھی تھی۔ مرتضیٰ کی مثنوی "وصل نامہ" میں وحدت الوجود کے مسائل بیان

کئے گئے ہیں۔ مختار نے سنہ ۱۶۸۲ء میں ایک طویل مثنوی معراج نامہ لکھی تھی جس میں تیس ہزار ابیات ہیں۔ حسینی شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے وہ غزل گو تھے اور ان کا دیوان موجود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

تمہارے دید کا لذت ہمارے آز سوں پوچھو
ہور اپنے حسن کی خوبی یو چشم ناز سوں پوچھو
سینے سے کھینچ کو سینہ لگائے شوق سوں پیارے
اور اس ہور خوشی جی کی اسی جاں باز سوں پوچھو
حسینی منتظر بیٹھا ہے کس سوں چاند سوں مکھ کا
اگر ہو دل منے پیارے تو یو کیوں راز سوں پوچھو

قدرتی اس دور کا ایک مثنوی گو تھا۔ اس نے ایک طویل مثنوی قصص الانبیاء لکھی تھی۔ جس میں دس ہزار بیتیں ہیں۔ یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ بلکہ خود قدرتی نے یہ قصے مختلف کتابوں اور تفسیروں سے اخذ کر کے لکھے ہیں۔

قادر شاہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ تھے اور عام طور پر قادر لنگا کہلاتے تھے۔ انھوں نے غزلیں مثنویاں اور مرثیے لکھے۔ زیادہ تر تصوف و اخلاق کے مضامین لکھتے تھے۔ ان کی ایک مثنوی معجزۂ خاتونِ جنت بھی موجود ہے

کلام کے نمونے شائع ہو چکے ہیں۔

شاہ من عرف[۳۲] بھی امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔ اور انہی کی طرز میں گیت اور نظمیں لکھا کرتے تھے۔

اسی طرح شاہ[۳۳] معظم بھی اسی سلسلہ کے شاعر اور قادر کے مرید تھے۔ ان کی مثنویاں شجوۃ الاتقیا اور گنج مخفی موجود ہیں۔

یہ دور انہی مذہبی شعرا پر ختم ہو جاتا ہے۔ اصل میں علی عادل شاہ شاہی کے ساتھ بیجاپور کی آزادی اور مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ اور دربار کی قدر دانی سے جس قسم کے شاعر پیدا ہو سکتے تھے۔ ان کا سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا۔ اس مذہبی قسم کی شاعری بعد کے دور میں چلتی رہی اور مرثیے بھی عام طور پر مقبول رہے۔

ان مرثیہ گویوں میں مرزا[۳۴] بیجاپوری بہت مشہور ہوا اس نے سوائے مرثیوں کے اور کچھ نہ لکھا۔ علی عادل شاہ نے مدح لکھنے کی فرمائش کی تھی تو مرثیہ لکھ کر بادشاہ کے نام سے معنون کر دیا اور کہا جاتا ہے کہ مرثیہ پڑھتے وقت ہی فوت ہو گیا۔ اس کے مرثیے دکن میں اب تک مقبول ہیں۔ اور ایک مرثیہ تو اب تک پڑھا جاتا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

الودا اے الودا شاہ شہیداں الودا
الودا ابن علی دوجگ کے سلطاں الودا

یو شفق نتیں ہے گگن پر صبح و شام اس درد سوں
نت بھراویں لہو منے دامن گریباں الودا
اس جفا کے تیر بیٹھے ہیں گگن کے تن اوپر
نیں سنتارے ہیں یو سب دستے ہیں پیکاں الودا
شہ کا ماتم سن دریا کی موج نت نعرا کرے
غرق ہیں اس غم سوں سب لولو و مرجاں الودا
ہر محرم ہیں حسین کے درد کے تانے ہزار
دل اوپر مرثا کوں ہوتے ہیں یو داغاں الودا

قطب شاہی عہد

سنہ ۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ء تک

بہمنی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہان قطبیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق دولت و ثروت، تعمیر کاری اور علم و ادب کی سرپرستی ہمیشہ یاد رہے گی اردو زبان اور ادب نے بھی ان کے عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔ انھوں نے سنہ ۱۵۰۸ء سے سنہ ۱۶۸۷ء تک تقریباً ۱۸۰ سال تک گولکنڈہ اور دکن کے زیادہ تر آندھرا علاقوں پر حکمرانی کی۔ ان کے عہد کے اردو ادب کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ ابتدائی کوششیں جو سنہ ۱۵۰۸ء سے ۱۵۸۰ء کے درمیانی ۷۲ سالوں پر مشتمل رہیں۔

ب عروج کا زمانہ جو ۱۵۸۰ سے ۱۶۷۲ء تک جاری رہا۔

ج دور انتشار جو ۱۵۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۶۸۷ء

پر ختم ہوا۔

ابتدائی کوششیں

۱۵۰۸ء سے ۱۵۸۰ء تک

(گولکنڈہ کے پہلے چار بادشاہ سلطان قلی۔ جمشید قلی سبحان قلی۔ اور ابراہیم قلی زیادہ تر جنگ و جدل اور استحکام سلطنت میں مصروف رہے) جمشید فارسی کا اچھا شاعر اور ارباب شعر اور اصحاب علم کا قدر داں تھا۔ اس کا فارسی کلام موجود ہے اور کلام الملوک (سلسلہ یوسفیہ) میں شائع ہو چکا ہے۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم قلی قطب شاہ (سنہ ۱۵۵۰ء تا سنہ ۱۵۸۰ء) اگرچہ خود شاعر نہیں تھا لیکن علم و فضل اور شعر و سخن کا دلدادہ تھا اور دراصل اس کے دور میں گولکنڈہ میں اردو زبان و ادب کا ایک ماحول پیدا ہو گیا کہ عوام کے علاوہ خود اس کا فرزند محمد قلی عالم شہزادگی ہی سے اردو شاعری کا رسیا ثابت ہوا۔

(ابراہیم اپنے والد سلطان قلی کی شہادت اور جمشید کی تخت نشینی کے بعد سے وجیانگر میں سات سال تک پناہ گزیں رہا اور آخر کار وہیں کی اخلاقی تائید سے گولکنڈہ پر قابض ہوا تھا اس لئے اس کے دل میں غیر مسلم رعایا کے لئے خاص جگہ تھی اور مذہب و مسلک کے لحاظ سے بھی اس نے بڑی وسیع النظری سے کام لیا اور اپنے شہر اور محل کو مختلف مذہبوں اور کلچروں

کا گلدستہ بنائے رکھا۔ چنانچہ اس کی اولاد بھی مختلف زبانیں بولنے والی اور مختلف مذہبوں کے ماننے والی عورتوں میں سے تھی۔ اس کے بڑے شہزادہ شاہ عبدالقادر کی ماں بیدر کے ایک مشہور مشائخ خاندان سے تھی۔ شہزادہ محمد قلی اور شہزادہ خدا بندہ کی ماں ایک آندھرا خاتون بھاگیہ وتی تھی۔ اور شہزادہ محمد امین کی والدہ ایران کے سادات سے تھی اور شہزادہ حسین قلی ایک شیعہ خاتون کے بطن سے تھا۔ اس نے آندھراؤں، حبشیوں، دکنی مسلمانوں اور ایرانیوں کو اپنے دربار میں مساوی ترقی کے مواقع دئے اور دور دور کے صاحبان کمال اس کے پایہ تخت میں جمع ہوتے گئے۔

(وہ ہمیشہ سفر و حضر میں اہل فضل و ہنر کو اپنے ساتھ رکھتا تھا جو اس کی مجلس میں علوم دینی اور مسائل دینوی پر بحث و مباحثہ کرتے۔ اس نے گولکنڈہ میں ایسے مدرسے قائم کئے جن میں مفت تعلیم کے علاوہ طلبا کو وظیفے اور انعام بھی دیئے جاتے تھے۔ وہ شاعروں اور عالموں کا اتنا قدر داں تھا کہ جب کبھی شاہی باغوں سے میوہ آتا اس کا کچھ حصہ ان کے لئے ضرور روزانہ کرتا۔ اس نے جمشید کے قائم کئے ہوئے لنگر خانے کی امداد میں بھی کافی اضافہ کردیا تھا جس کی وجہ سے عالموں اور شاعروں کو زیادہ فراغ حالی نصیب ہوگئی تھی۔

ابراہیم نے تلنگی شاعری کی بھی بڑی قدردانی کی۔ اس کے عہد میں کئی تلنگی شاعر شاہی سرپرستی سے مستفید ہوئے ان میں سے ایک پونی کنتی تیلی گنانے جو اس کے ایک امیر امین خاں کا متوسل تھا۔ اپنی ایک نظم یا یتی چرتر میں پانچ سو سطروں میں اپنی قدردانی کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ جب میں نظم سنانے کے لئے گیا تو مجھے قریب بیٹھنے کی عزت بخشی گئی۔ میرے جسم پر خوشبوئیں لگائی گئیں ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کا شال میرے کندھوں پر ڈالا گیا۔ اور جواہرات کا ایک ڈبہ مجھے دیا گیا اور پھر نظم سنانے کی فرمائش کی گئی۔

ان تمام بین قومی اور بین لسانی قدر افزائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی فضا اردو کے لئے بہت ہی سازگار بن گئی۔ چنانچہ ابراہیم کے دور میں گولکنڈہ میں جو شاعر اردو شعر و سخن کی صورت گری کر رہے تھے۔ ان میں سے ملا خیالی فیروز اور سید محمود بہت مشہور ہیں۔

ملا خیالی اتنا مشہور اور خوشحال شاعر تھا کہ اس نے سنہ ۱۶۶۵ء میں ایک دو منزلہ خوبصورت مسجد قلعہ گولکنڈہ کے باہر اپنے پر فضا باغ میں بنائی تھی۔ جو اب بھی موجود ہے۔ ملا خیالی کا کلام اب نہیں ملا لیکن بعد کے اساتذہ سخن ابن نشاطی وغیرہ نے اس کو استاد مانا ہے اور اس کی صاحب کمالی کا ذکر کیا ہے۔

سید محمود[۲] کا ذکر بھی بعد کے اردو شاعروں خصوصاً وجہی اور ابن نشاطی نے کیا ہے۔ اور اس کے ذوق سخن کی تعریف کی ہے۔ لیکن اس کا کلام بھی اب تک نہیں ملا۔

فیروز[۳] ۔ اصل میں بیدر کا باشندہ تھا۔ اور اس کا ذکر بہمنی دور کے تحت آچکا ہے۔ اور وہ ان صاحبان کمال میں تھا جو مختلف مقامات سے گولکنڈہ آکر ابراہیم قطب شاہ کی قدردانی سے سرفراز ہوئے تھے۔ انھوں نے گولکنڈہ میں جو کلام لکھا اس کا اب تک پتہ نہ چل سکا۔ لیکن وجہی اور ابن نشاطی دونوں اس کے مدح سرا ہیں۔ وجہی لکھتا ہے ؎

کہ فیروز آخواب میں رات کوں — دعا دے کہ چومے مرے ہاتھ کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس — کہ پڑھنے کو عالم کرے سب ہوس
تو یوں کر کہ خصلت لو تجھ آئے نا — کہ توں خوش اچھے ہور کسے بھائے نا
توں ایسی طرز دل تے پنجا نوی — کہ دوسرے کریں سب تری پیروی

ب۔ عروج کا زمانہ

سنہ ۱۵۸۰ء سے ۱۶۷۲ء تک (ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت گولکنڈہ اردو کا ایک مرکز بن چکا تھا۔ وجہی۔ احمد اور غواصی اسی کے دور میں پیدا ہوئے اور اردو شعر و سخن کے ذوق سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کا فرزند محمد[۴] قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) تو علم و ادب کا پروانہ تھا۔ اس نے فارسی۔ اردو اور تلنگی تینوں زبانوں میں شعر لکھے۔ اس کا اردو کلام پچاس ہزار اشعار

پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ پورا کلام اب موجود نہیں ہے۔ تلنگی کے مجموعہ کا تو پتہ ہی نہ چل سکا۔ البتہ فارسی اور اردو کا کچھ کلام دستیاب ہو چکا ہے۔ چنانچہ کلام الملوک (سلسلۂ یو سفیہ) میں اس کا فارسی کلام چھپا اور راقم الحروف نے اس کا اردو کلیات جو ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔

موجودہ معلومات کے لحاظ سے محمد قلی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے دیوان میں غزلیں مثنویاں۔ قصیدے۔ مرثیے اور رباعیات غرض جملہ اصناف سخن کے وافر نمونے موجود ہیں۔ اس نے ایسے ایسے موضوعوں پر بھی لکھا ہے۔ جن کی طرف اردو کے شعراء نے سوائے نظیر اکبر آبادی کے عام طور پر توجہ نہیں کی۔ اس نے اپنے عہد کی عام زندگی۔ رسم و رواج۔ تہواروں اور تقریبوں کی تفصیلات۔ موسموں کی خصوصیات اور کھیل کود غرض کہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع اور معمولی سے معمولی واقعات پر بھی اعلیٰ پایہ کی نظمیں لکھی ہیں۔ بادشاہ ہونے کے باوجود وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھا۔ اس کی غزلیں سادگی اور لطافت کے اعتبار سے حافظ کی غزلوں سے ملتی جلتی ہیں اس کی قادرالکلامی کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ اس نے ان حالات کو بھی نہایت روانی اور خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے جو فارسی میں اس وقت پیش کئے گئے تھے۔ جب کہ

اس کا لسانی ارتقا عروج پر پہونچ چکا تھا۔ دکن کی بارش بہت مشہور ہے۔ اور محمد قلی نے برسات کی آمد پر بڑی عمدہ عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں لکھتا ہے ؎

پلا ساقی سے ہور خوشی سیتی تاچ — ہوا سبز و خرم ہوا جیا پاچ
تمن شوق کا نیں تھے مینھ چوے — اے باتاں نہیں جھوٹ تم دیکھو ساچ
کہو دا کہ جھاڑاں کوں میرا سلام — تمن آرزو دل ہوا شیشہ کاچ
خوشی شادی سے تیں ہمن بزم میں — صراحیاں آپر ساقی پیالاں کوں راچ
جلا دسپند تا نہ لاگے نظر — دو تن آگ میں تم پکا دو کماچ

معانی علی دم تھے خوش ہے ہوا
کہو مطرباں کوں بجاؤ کماچ

محمد قلی ابتدا میں معانی تخلص کرتا تھا۔ بعد میں قطب شہ اختیار کیا۔ بسنت پر بھی اس نے متعدد قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں بسنت کھیلنے کا اس طرح ذکر کیا ہے :-

بسنت کھیلیں عشق کی آپیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
نچھل کندن کے تاراں رنگ جھونا
بندی ہوں چھند بندسوں کر سنگارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور سا جنا یوں
کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
پیا پگ پر ملا کر لیائی پیاری

بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا

نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ

رنگیلا ہو رہیا ترلوک سارا

محمد علی قطب شاہ کے دور کے اردو شعرا میں وجہی سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا۔ اس نے ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں ایک کتاب قطب مشتری لکھی۔ جس میں خود بادشاہ کی بھاگمتی کے ساتھ عشق کی داستان استعارے کے پیرائے میں بیان کی ہے۔ (یہ کتاب اپنے دلکش اسلوب اور اعلیٰ تخیل کی وجہ سے قدیم اردو کی بہترین کتابوں میں سمجھی جاتی ہے) اس کے دیباچہ میں وجہی نے اس طرح اپنے کلام کی بڑائی ظاہر کی ہے۔

نہ پہنچے نہ پہنچا ہے گن گیان میں

سو طوطی منجھ ایسا ہندوستان میں

کہ باتاں یہ سنکر مری گیان کیاں

رہیاں تھک ہو طوطیاں خراسانکیاں

جتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے

سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے

وجہی کی قطب مشتری کے علاوہ اردو نثر میں دو کتابیں سب رس اور تاج الحقائق بھی اب تک دستیاب ہو چکی ہیں سب رس تو بہت بعد کو سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں سنہ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۴ء میں قلم بند ہوئی۔ قطب مشتری اور سب رس دونوں چھپ چکی ہیں۔ تاج الحقائق

راقم الحروف نے مرتب کر کے سلسلۂ یوسفیہ سے چھپوا دی ہے لیکن ابھی شائع نہیں ہوئی۔ افسوس کہ وجہی کا اردو کلیات اب تک دستیاب نہ ہوا۔ البتہ فارسی دیوان موجود ہے۔

محمد قلی کے کلیات کی طرح وجہی کی سب رس بھی قدیم اردو کی بہت ہی قابل قدر تصنیف ہے۔ قطب مشتری کی طرح یہ قصہ بھی استعارے کے پیرایہ میں لکھا گیا اور اردو کی پہلی ادبی نثر سمجھا جاتا ہے۔

وجہی گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعراء تھا اور اس کے زمانے میں آندھرا دیش میں اتنے ادیب اور شاعر پیدا ہو چکے تھے کہ اس نے اپنے وطن کے متعلق یہ فخریہ شعر لکھے تھے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہی لگ
دکھن ملک دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سر ہوا دکن تاج ہے
دکھن ملک بہو تیج خاصہ اہے
تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

ملا احمد بھی وجہی کا ہم عصر تھا۔ اب تک اس کی صرف دو کتابیں قصۂ لیلیٰ مجنوں (سنہ ۱۶۰۰ء) اور احوال مصیبت

اہلِ بیت دستیاب ہو چکی ہیں۔ اس نے سنہ ۱۶۵۰ء سے قبل وفات پائی۔ ابن نشاطی نے بھی پھولبن میں اس کو یاد کیا ہے۔ اور اس کے کلام کی تعریف کی ہے اس کا کلام وجہی کے ہم رنگ ہے۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں کا سبب تالیف اس طرح بیان کرتا ہے:

جو شہ آپ تھے آپ منجھ یاد کر
منجے غم کی بندگی سے آزاد کر

دیئے امر اعلیٰ کہ یہ باغ لاؤں
جو پالوں اسے شاہ امریت ناؤں

جو ہیں شاہ کا امر سر پر سیتا
ترت باغ لانے شتابی کیتا

بہوتیک پریشانی روزگار
اگر منجے ہے ملامت سوبار

سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ تا ۱۶۲۵ء) جو محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ شاعری سے زیادہ علم وفضل کا دلدادہ تھا۔ کتابیں جمع کرنے، ان کو توجہ سے پڑھنے اور ان پہ اپنی رائے اور دستخط ثبت کرنے کا اس کو بڑا شوق تھا۔ خود محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی اس نے جمع اور مرتب کیا تھا اور اس پر اردو میں ایک طویل منظوم دیباچہ لکھا تھا جس میں محمد قلی قطب شاہ کی طبیعت اور سخن طرازی کی خصوصیات تفصیل

سے بیان کی تھیں وہ ظل اللہ تخلص کرتا تھا۔ اس نے اپنے دیباچہ کے آخر میں محمد قلی کی اس خوبی پر زور دیا ہے کہ وہ دوسرے شاعروں کی طرح خود ستائی نہیں کرتے تھے اور ہر مقطع میں حضرت علیؓ کا نام ضرور لاتے تھے۔ کہتا ہے ؎

رہیا جائے نہ شاعراں من منیں
بنا کہئے صفت شعر کے فن منیں
جو خاصہ ہے یو شاعراں کا ہمایک
نہ ریں بن کہے وصف بتیاں کیتک
مگر شاہ کہے بیت پچاس ہزار
دھرے وصف اپس سوں کہن بہوت عار
وتا شعر کہہ بیت میں ایک بات
کہیں نیں لکھے آپنے وصف سات
جو مقطع میں ہر ایک اپس شعر کے
لئے بن سو حضرت علی نا ڈل اپے
نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام
بغیر ان علی کا لئے باج نام

محمد قطب شاہ کے اردو اور فارسی کلام کے نمونے شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کا اردو کلیات ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ سلطان محمد کے دور کے اردو شاعروں میں غواصی بہت مشہور ہوا۔ وہ اگرچہ محمد قلی کے دور ہی سے ایک علیحدہ

دبستان سخن بنا چکا تھا۔ مگر وجہی کی ملک الشعرائی کے آگے اس کا چراغ جل نہ سکا۔ اس کے کلیات میں بعض غزلیں محمد قلی کی غزلوں کی زمینوں میں ہیں اور ایک آدھ غزل تو دونوں کے دیوان میں بہ تبدیل تخلص موجود ہے۔ یہ کلیات ابھی غیر مطبوعہ ہے ایک مثنوی چند اور لوری بھی اسی دور میں لکھی تھی جو ابھی چھپی نہیں ہے۔

غواصی کی مشہور مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال (سنہ ۱۶۲۴ء) سلطان محمد قطب شاہ ہی کے آخر میں لکھی گئی تھی۔ مگر ان کا انتقال ہو جانے پر اس کے کمسن جانشین سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے نام غواصی نے معنون کر دی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں جہاں بادشاہ وقت کی مدح لکھی ہے۔ اس میں پہلے اس نے سلطان محمد کا نام اس طرح لکھا تھا ؎

سو سلطان محمد قطب شاہ گنبھیر
جگ آدھار ہے ہور جگ دستگیر

لیکن جب اس بادشاہ کا اچانک مختصر سی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ تو غواصی نے اس شعر کو بدل دیا اور باقی شعر وہی رہنے دیئے جو یہ ہیں ؎

جو سلطان عبد اللہ آفاق گیر
سلکھن شہنشاہ گردوں سریر

چندا جو دھواں خسروی برج کا

امونک رتن حسن کے ورج کا
سگل باوشاہاں میں اس کا ہے ناوں
اسی قطب کا قطب تارا ہے جھاوں

غواصی کی تیسری مثنوی طوطی نامہ عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں سنہ ۱۶۳۹ء میں لکھی گئی۔ یہ غالباً اس کی آخری طویل نظم تھی۔ اس وقت تک وہ مذہب و تصوف کی طرف مائل ہو چکا تھا اور چند سال بعد ہی انتقال کر گیا۔ مشہور مثنوی کا اس نے طوطی نامہ میں ترجمہ کیا تھا جو بہت مشہور ہوا۔ غواصی اصل میں قصیدہ گو شاعر تھا اور گولکنڈہ کے کسی اور شاعر کے اس پایہ کے قصیدے موجود نہیں ہیں عبداللہ قطب شاہ نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی اور سنہ ۱۶۴۴ء میں اس کو سفیر بنا کر بیجاپور روانہ کیا جہاں کے دربار اور شاعروں میں اس کی خاطر خواہ قدر و منزلت کی گئی اور وہ کثیر انعام و اکرام حاصل کر کے گولکنڈہ واپس ہوا۔

حسنؔ شوقی اسی دور میں سلطان محمد قطب شاہ کی علم دوستی کا شہرہ سن کر حیدرآیا تھا۔ اس کا ذکر بیجاپور کے شاعروں میں گزر چکا ہے۔ لیکن وہ گولکنڈہ میں بھی بہت مقبول رہا اور یہاں کے شاعروں میں اپنا رنگ جماتا رہا اور غالباً محمد قطب شاہ کی تعریف میں قصیدے اور اس کی فرمائش پر کوئی مثنوی بھی لکھی۔ لیکن یہ اب ناپید ہے

اس نے ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء سے پہلے انتقال کیا۔ کیونکہ اس سال جب ابن نشاطی نے پھول بن لکھی تو اس میں جہاں دوسرے مشہور شاعروں کا ذکر کیا ہے اس کا بھی نام لیا ہے اور متوقع ہے کہ اگر حسن شوقی زندہ ہوتا تو میرے کلام کی بہت داد دیتا۔

سلطان محمد کی وفات کے بعد جب اس کا کمسن شہزادہ عبداللہ حیدرآباد کا بادشاہ بنا (۱۶۲۵ تا ۱۶۷۲ء) تو قطب شاہی دربار میں علم وفضل کے مقابلہ میں پھر سے اردو شاعری کو ترجیح حاصل ہوگئی۔ اور عہد محمد قلی کے شاعروں کی بن آئی۔ وجہی اور غواصی جیسے اساتذۂ سخن جو محمد قلی کی وفات کے بعد سے دلگیر ہوکر خانہ نشین سے ہوگئے تھے پھر دربار میں بلائے گئے اور شاہی انعام واکرام سے بہرہ ور ہونے لگے چنانچہ وجہی نے اپنے باریابی کا ذکر سب رس کے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے۔

"صباح کے وقت۔ بیٹھے تخت۔ یکایک غیب نے کچھ رمز پاکر۔ دل میں اپنے کچھ لیا کر۔ وجہی نادرفن کوں۔ دریا دل۔ گوہر سخن کوں حضو بلائے پان دیئے۔ بہت مان دیئے ہور فرمائے کہ انسان کے وجود میں کچھ عشق کا بیان کرنا۔ اپنا نا دل عیاں کرنا۔ کچھ نشان دھرنا۔ وجہی یو گنی گن بھریا۔ تسلیم کرکر سر پر ہاتھ دھریا۔"

وجہی کی طرح غواصی بھی سلطان عبداللہ کی قدردانی شعروسخن سے اتنا متاثر ہوا کہ مثنوی طوطی نامہ میں اس

واقعہ کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے شعر یہ ہیں ؎

کہیں یوں بحق علی ولی ـــــ
ـــــ کہ پھر مگ میں آیا محمد قلی
ڈوبے تھے ہنرمند سو پھر کر ـــــ
ـــــ نکل آئے تجھ دور میں تیر کر
دیا جیو پھر راگ ہور رنگ کوں ـــــ
ـــــ کیا دور سینیاں پو کے زنگ کوں

عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد میں جتنے بلند پایہ شاعر اور ادیب جمع تھے اور جیسی اعلیٰ درجہ کی کتابیں اردو نظم و نثر میں لکھی گئیں اور علم و فضل اور شعر و سخن کی جس طرح قدر و منزلت کی گئی اس پر بجائے خود ایک علیحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

خود سلطان عبد اللہ قطب شاہ اردو اور فارسی کا ایک اچھا شاعر اور ماہر موسیقی تھا اور اس کے نانا محمد قلی کے کلمات کی طرح اس کی اردو دیوان بھی موجود ہے۔ اور سلسلۂ یوسفیہ میں چھپ چکا ہے۔ اس نے بھی محمد قلی کی طرح مختلف موضوعوں پر لکھا ہے۔ لیکن اس کے کلام میں اتنی گہرائی اور وسعت نہیں ہے۔ البتہ زبان زیادہ صاف ہو گئی ہے۔ اس نے بسنت اور نوروز پر کئی غزلیں لکھی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

بسنت آیا پھلیا پھول لالہ

سکھی لیا اب صراحی ہور پیالہ
چمن میا نے پھلیا ہے پھول رنگ رنگ
پنٹ نازک ایکس تے ایک آلا
لڑاں جھاڑاں کی پیڑاں میانے بھر بیٹاں
جھڑی پکڑے ہیں پانی کا جوالا
ہوا مدپینے کا آیا ہے پیارے
تو مدپینے کو من کرتا اُلالا

عبداللہ قطب شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کے نورس نامے کے جواب میں اس موضوع پر ایک طویل منظوم کتاب بھی اردو میں لکھی تھی۔ جو ایک خانگی کتب خانہ میں موجود ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے دو اور درباری شاعر ملک خوشنود اور جنیدی بھی قابل ذکر ہیں۔ ملک خوشنود کی ابتدائی زندگی قطب شاہی دربار میں گذری تھی۔ لیکن بعد کو سلطان عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم کے جہیز میں وہ بطور غلام بیجاپور روانہ کر دیا گیا تھا لیکن حیدرآباد کے اس غلام نے عادل شاہی دربار میں آہستہ آہستہ بحیثیت شاعر جو جگہ حاصل کرلی اس کا ذکر بیجاپوری ادب میں گذر چکا ہے۔

جنیدی کا نام علی اکبر تھا اور عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۲ء میں اس کو سر نوبت کے عہدے پر سرفراز کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو جنیدی نے ملازمت ترک

کردی تھی اور برہان پور میں مقیم ہوگیا تھا۔ اس نے سنہ ۱۶۵۴ء میں مثنوی مالا پیکر لکھی تھی۔

اس عہد کے دوسرے شعرائے اردو میں ابن نشاطی[۱۳] بہت بڑا فنکار گذرا ہے جس نے سنہ ۱۶۵۵ء میں اپنی مشہور مثنوی پھول بن لکھی جس میں نہایت سادگی اور پرکاری کے ساتھ اکثر و بیشتر صنعتوں کو استعمال کیا ہے۔

ابن نشاطی دراصل ایک صاحب ذوق انشاء پرداز تھا اور شاعری اور سخن گستری اس کا پیشہ نہیں تھا وجہی یا غواصی کے برعکس اس کو شاہی دربار سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا عوامی شاعر تھا اور دربار سے زیادہ عوام ہی میں اس کو شہرت نصیب ہوئی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

حضور یاں ہیں مرا گر سلک اچھتا
گہر ریزہ اس نے میرا کلک اچھتا
فراغت اس تے گر ٹک منج کوں ہوتا
لے موتیاں خوب میں اس تے پروتا
بڑیاں کے ناد چھتا تو بڑا پن
مسیحا کا دکھاتا بات میں فن
زمانہ نا سمجھ کر قدر میرا
بچھا یا ہے دلی سوں صدر میرا

ابن نشاطی نے اپنے عنفوان شباب میں اپنی مثنوی۔

پھولبن لکھی تھی اور اس میں اپنے ہم عصروں یا پیش رو اساتذۂ سخن کی طرح اس نے کوئی شیخی یا تعلی نہیں کی ہے۔ بلکہ جگہ جگہ عجز و انکسار سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے حریفوں پر چوٹ کے بجائے اپنے پیش رو اساتذۂ سخن کے موجود نہ ہونے پر اس لئے اظہار افسوس کرتا ہے کہ اگر وہ اس تصنیف کو دیکھتے تو اس کی سچی قدر کرتے۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
کہ دیتا شاعری کی کچھ مری داد

اہے صد حیف جو نہیں سید محمود
کتے پانی کوں پانی دود کوں دود

نہیں اس وقت پر وہ شیخ احمد
سخن کا دیکھتے باندھیا سو میں صد

حسن شوقی اگر ہوتا تو الحال
ہزاروں بھیجتا رحمت منج اپمال

اچھے تو دیکھتا ملا خیالی
یو میں برتیا ہوں سو صاحب کمالی

واقعہ یہ ہے کہ ابن نشاطی حیدرآباد کے ادب اور سخن گستری کے اس دور کا ایسا صاحب کمال تھا جس نے شاعروں اور ادیبوں کو درباری اور سرکاری قدر دانی سے بے نیاز ہو کر شعر و سخن میں مصروف رہنے کا راستہ سمجھا دیا۔ چنانچہ اس کے بعد کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام

ملتے ہیں جن کی تصنیف و تالیف کا شاہی سرپرستی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ ان میں سید بلاقی شاہ راجو۔ میراں جی خدانما فاروقی اور میراں یعقوب کے کارنامے اب تک مشہور ہیں جو عہد عبداللہ قطب شاہ کا تحفہ ہیں۔

اسی دور کا ایک شاعر قطبی[۱۴] بھی تھا جس نے شیخ یوسف دہلوی کی کتاب تحفۃ النصائح کا اردو ترجمہ سنہ ۱۶۳۷ء میں کیا تھا۔ یہ ۱۵۰۰ شعر کی ایک مذہبی نظم ہے اور ابھی تک نہیں چھپی۔

سلطان[۱۵] اس دور کے ایک صوفی تھے جن کا کلیات اردو موجود ہے لیکن یہ سارا کلام تصوف و عرفان کے مسائل اور تخیل سے معمور ہے۔

سید بلاقی[۱۶] عبداللہ قطب شاہ کے مقربین سے تھے۔ ان کی ایک مذہبی مثنوی معراج نامہ (۱۶۶۹ء/۱۵۰۰ ابیات) لکھی جو چھپ چکی ہے۔ یہ اصل میں کسی فارسی معراج نامہ کا ترجمہ ہے۔

شاہ راجو[۱۷]۔ اس عہد کے ایک با اثر مرشد اور صوفی تھے۔ ان کو تصوف و عرفان کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دخل تھا اور شعر و شاعری میں بھی ان کی مختلف نظمیں اور مرثیے بیاضوں میں ملتے ہیں۔ اس عہد کے خواص و عوام کی طرح بعض شاعر بھی ان کے مرید و معتقد تھے۔ جن میں طبعی اور عابد قابل ذکر ہیں۔

عابد نے تصوف و عرفان کے موضوعوں پر مختلف نظمیں لکھی تھیں۔ ان کو شاہ راجو نے عابد شاہ کا لقب عطا کیا تھا انھوں نے اپنی ایک مثنوی گلزار السّالکین کے دیباچہ میں اپنے مرشد کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

مرا پیر مجھ تن کوں بتلا دیا
اسی تن میں احمد کوں دکھلا دیا
اسی نور کوں لے پھر اتن منے
تو پایا خدا تن کے گلشن منے
الٰہی بحق شفیع الامم
تو رکھ شاہ راجو پہ اپنا کرم
الٰہی بحق وصی مصطفےٰ
تو رکھ تندرست انکے تئیں تا بقا
الٰہی بحق حسین و حسن!
تو رکھ ان کو آفات سے تن بتن

اس مثنوی کے علاوہ عابد شاہ نے خواجہ بندہ نواز کی فارسی کتاب معالجات بندہ نواز کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

میراں جی حسن خداوند خدانما بھی حیدرآباد میں تصوف اور شعر و ادب کے رسیا گذرے ہیں۔ ان دونوں میں فرق اتنا تھا کہ شاہ راجو دین کے ساتھ

TEXT BOOK

دنیا کو بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ اور میراں جی خدا نما دنیا کو چھوڑ کر یعنی عبد اللہ قطب شاہ کی ملازمت ترک کر کے دین کی طرف راغب ہوئے تھے۔ انھوں نے کئی اردو رسالے اور نظمیں لکھیں۔ رسالہ وجودیہ۔ شروح تمہیدات عین القضات اور شرح مرغوب القلوب ان کی وہ اردو نثر کی کتابیں ہیں جو اب تک محفوظ ہیں۔ عورتوں کو چکی پیستے وقت گانے کے لئے انھوں نے ایک چکی نامہ بھی لکھ دیا تھا۔ جو بہت مقبول ہوا اور حیدرآباد کے بعض گھرانوں کی عورتیں اب تک اسی کو گاتی ہیں۔ اس کا ایک بند یہ ہے ؎

XT BOOK

اول اللہ ناؤں صفت جس کا ٹھاؤں
یاد ہے میرے جی میں ہردم تیرا ناؤں
لا الہ کہنا الا اللہ میں رہنا!
نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا
اللہ آپی گنج خفی ظاہر ہونے آیا
نبی صاحب کے برقعے میں آپس کوں دکھلایا
لا الہ کہنا الا اللہ میں رہنا
نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

انہی خداوند خدا نما کے ایک شاعر مرید شاہ قادری نے چکی نامہ کی طرز پر ایک اور نظم عورتوں کے لئے لکھی تھی جو غالباً جلوے کے وقت یا کسی اور تقریب میں گائی جاتی

تھی ۔ اس میں انھوں نے اپنے پیر کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔

خداوند شاہ دیں قدرت بنا ہم میں ندرت پیر ملے رسول حضرت دیکھ سلطان سبحان
ہمیں ناؤں پر ہیں قربان

فکر کر فارقی لیائے سب گنہاں پائے شاہ کا جلوہ دل دل گائے سلطان سبحان
ہمیں ناؤں پر ہیں قربان

میراں جی خدا نما کے ایک اور مرید میراں یعقوب بھی اردو کے بہت اچھے ادیب تھے ۔ انھوں نے سنہ ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں برہان الدین اولیاء اورنگ آبادی کی کتاب شمائل الاتقیا کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا ۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے ۔ انھوں نے اس میں اپنے مرشد کا ذکر اس طرح کیا ہے اس سے اس کے اسلوب کا اندازہ ہو سکے گا

"موحداں کے پیشوا ۔ مریداں کے دستگیر ۔ طالباں کے رہنما ۔ بوجھسا رے علم لدنی کے ۔ سوچنہارے حقیقتاں دین و دنیا کے ۔ پیر پیراں سید میراں چشتی قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں پایا ۔ ہور باطن کے عالم تھے ظاہر کے عالم میں پایا ۔ ہمیشہ ان کی عنایت کی نظر سوں پرورش پاتا تھا ۔ ہور دن دن اس شعور ہور اس ہوش میں آتا تھا ۔ جب بلوغت میں آکر دست بیعت نعت پایا ۔ تب ارشاد و تلقین کی لذت سوں اگھایا ۔ شریعت طریقت کے وضع وضع کے مزے چکھائے ہور معرفت و حقیقت کے جنس جنس کے تماشے دکھائے ۔"

میراں جی اور شاہ راجو دونوں قطب شاہی حیدرآباد کے دورِ آخر کی بہت بڑی شخصیتیں تھیں۔ ان دونوں کے عالیشان گنبد اب تک حیدرآباد میں موجود ہیں۔

ج - دورِ انتشار ۱۶۷۲ء سے ۱۶۸۷ء | عبد اللہ قطب شاہ کے آخری زمانہ میں اورنگ زیب کے حملہ کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت میں انتشار پیدا ہو چکا تھا اورنگ زیب سے سنہ ۱۶۲۶ء میں جو صلح ہوئی وہ صلح نہ تھی بلکہ قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ چنانچہ اس تاریخ سے عبد اللہ نے اپنی ایک نئی مہر "ختم بالخیر والسعادۃ" بنالی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ سلطنت کا خاتمہ بخیر و خوبی سے ہو گیا۔ اورنگ زیب کا سفیر ہر معاملہ میں دخل دیا کرتا اور قطب شاہیوں کی آزادی اور سربلندی اور وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی جودت و بیباکی ختم ہو گئی اور وہ زیادہ تر مذہبی تصنیف و تالیف اور مرثیہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔

ایک ایسے ذہنی انتشار کے دور میں عبد اللہ کا انتقال ہوا اور اس کے داماد ابوالحسن نے جرأت کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ابوالحسن بھی شاہ راجو کا ایک مرید تھا جس کو انھوں نے حسبِ عادت تمام مریدوں کی طرح خطاب تاناشاہ اس وقت عطا کیا تھا جبکہ وہ پریشان حال اور غریب تھا اور ان کی خدمت گزاری میں مصروف۔ یہ خطاب اتنا

مشہور اور مقبول ہوا کہ جب ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں ابوالحسن اپنے خسر عبداللہ قطب شاہ کی وفات پر قسمت کی یاوری سے ابوالحسن قطب شاہ کے لقب سے حیدرآباد کا بادشاہ بنا۔ اور پندرہ سال تک بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بادشاہ رہا۔ اہل حیدرآباد نے اس کو تانا شاہی کے نام سے یاد کیا اور آج بھی یہ نام اردو زبان میں ضدی اور عیاش اور نازک دماغ اور ظالم غرض مختلف معنوں میں میں استعمال ہوتا ہے اور ابوالحسن کی یادخواہ بری طرح ہی سے کیوں نہ ہو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ بدقسمت اور بدنام ابوالحسن دراصل اس پروپیگنڈہ کا شکار رہے جو اس کی سلطنت چھیننے کے لئے اس کے مخالفوں نے پھیلا رکھا تھا۔ جہاں تک علم وادب اور شعروسخن کا تعلق ہے وہ اپنے پیشرو بادشاہوں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔ اور جس طرح سلطان عبداللہ نے ملا عبدالحکیم کی تاریخ قطب شاہی کا تکملہ حدیقۃ السلاطین ملا نظام الدین احمد سے لکھوایا تھا ابوالحسن نے موخرالذکر کا تکملہ حدائق السلاطین علی ابن طیفور بسطامی سے لکھوایا اس تاریخ کے دیباچہ میں علی ابن طیفور نے ابوالحسن کے عمدہ عادات وخصائل تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

تانا شاہ نے علی ابن طیفور کے علاوہ متعدد فارسی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی اور خود وہ اردو کا بہت اچھا شاعر تھا۔ اگرچہ انتزاع سلطنت کی وجہ

سے اس کا دیوان محفوظ نہ رہا۔ تاہم تذکروں میں اس کے اشعار محفوظ رہ گئے۔ اس کی ایک غزل اور نظم درج ذیل ہے جس سے معلوم ہوگا کہ اس کے یہاں زبان کی روانی کے علاوہ تخیل کی رعنائی بھی موجود ہے۔

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کر مری انجمن میں آ
کب لگ رہے گا جیوں لب تصویر بے سخن
اے شوخ خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ
چاہتا ہوں وصف قد میں کروں فکر شعر کی
اے معنیٔ بلند شتابی سوں من میں آ
اے جان بوالحسن توں اچھے خوش لٹک ستے
بند قبا کوں کھول کے صحن چمن میں آ

نظم

تجھ مکھ کوں کوئی چند رکہتے کوئی صورتیں انور کہتے
کوئی حسن کا بندر کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے
تو جھ لب کوں کوئی شکر کہتے کوئی شہد سوں برتر کہتے
کوئی خضر جاں پرور کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے
کوئی جیو کی پیاری کہتے کوئی سوں اچھن ناری کہتے
نیاریاں میں کوئی نیاری کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے
تجھ چک کوں کوئی کنچن کہتے کوئی ساحر پرفن کہتے
کوئی حقہ انجن کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

جوبن کوں تجھ کوئی گیج کتے یا دو سنتیاں سج کتے
یا دبھرے پنج کتے کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

ابوالحسن تانا شاہ کا ایک پیر بھائی طبعی[۲۳] بھی اس دور کا ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اس نے سنہ ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء میں ایک کتاب "بہرام وگل اندام" لکھی تھی۔ اس وقت ابوالحسن بادشاہ نہیں تھا البتہ بادشاہ وقت کا چہیتا داماد تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم میں ابوالحسن کے بادشاہ ــــ کے بعد طبعیؔ نے ابوالحسن کی مدح کے اشعار اضافہ کئے تھے۔ اسی کے دیباچہ میں اپنے اور بادشاہ کے مرشد شاہ راجو کی تعریف میں متعدد بیتیں لکھی ہیں۔ یہاں اس "مدح شاہ راجو" کی چند ابیات درج کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ طبعیؔ ابن نشاطی کے بعد حیدرآباد کا سب سے بڑا استاد سخن گذرا ہے اور اس نے ابن نشاطی کے نقش قدم پر چل کر بادشاہ کے دربار سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ حالانکہ وہ اس کا پیر بھائی بھی تھا اور آسانی سے ملک الشعرا بن سکتا تھا۔

دلی توں بڑا ہے گگر شاہ راجو
چل آیا ہے شہ تیرے گھر کا شاہ راجو
خبر تیری معلوم نئیں بے خبر کوں
خبر دار جانے خبر شاہ راجو
توں مخدوم سید محمد کی گھن کا

بہت بے بدل ہے گہر شاہ راجو
کرامت ہوا سب کوں معلوم ظاہر
توں باطن میں کر یک نظر شاہ راجو
دکن کا کیا بادشاہ بوالحسن کوں
بڑا تخت دے کر چھتر شاہ راجو
ترے عشق کا چوٹ کھایا سو چسڑھ کر
اترتا نہیں ہے اثر شاہ راجو
خدا پاس اپنا بات کرتا ہے طبعی
دعا تج کوں شام و سحر شاہ راجو

طبعی کی یہ مثنوی دکنی اردو کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ زبان کی سلاست اور شاعرانہ نزاکتوں میں طبعی اپنے پیشرو اساتذہ وجہی، غواصی اور ابن نشاطی سے تینوں پر بھی سبقت لے گیا ہے۔ وجہی کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا۔ اور جب طبعی اپنی یہ مثنوی لکھ رہا تھا تو وجہی ایک رات اس کے خواب میں آیا اور پوری مثنوی سن کر کہا نئی بات پیدا کی ہے۔ طبعی کہتا ہے ؎

اگیا میں جو مثنوی بولنے
یو موتیاں نجیں ڈھال تیوں رولنے
یو وجہی مرے خواب میں آئے کر
مکھ اپنا سورج ناو دکھلانے کر
سراسر سنیا جو مری مثنوی

کہیا بات طبعی ہے تیسری لوی
ہو خوش حال سنکر بو باتاں مرے
اپس کے ہاتاں میں ہاتاں مرے
بڑے پیار سوں اپنا دے یو مثل
سنیا سو پڑیا خواب سے میں اپیں

یعنی وجہی نے طبعی کو اپنا مثل یا ثانی وجہی کہا جو واقعہ یہ ہے کہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ جہاں ابن نشاطی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دبستان غواصی کا پیرو اور جانشین تھا۔ طبعی صحیح معنوں میں جانشین وجہی سمجھا جا سکتا ہے۔

طبعی اور ابوالحسن تانا شاہ کے دوسرے حیدرآبادی معاصر یہیں امینی۔ خواصی۔ سیوک اور افضل کی کتابیں مذہبی موضوعوں پر لکھی گئی تھیں اور اس وقت موجود ہیں۔ سنہ ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں امینی نے قصۂ ابوشحمہ اور خواصی[۲۵] نے قصۂ حسینی منظوم کیا تھا سیوک[۲۶] کا جنگ نامۂ محمد حنیف سنہ ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں لکھا گیا اور شاہ افضل قادری نے محی الدین نامہ[۲۷] ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں یعنی اسی سال لکھا جس سال کہ اورنگ زیب نے حیدرآباد کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ یہ سب کتابیں ادبی اعتبار سے طبعی اور ابن نشاطی کے کارناموں کے معیار کو نہیں پہونچتیں۔ البتہ افضل قادری اسی دور کا ایک ایسا بوڑھا شاعر تھا جو دبستان وجہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے سلطان عبداللہ کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے تھے۔ وہ خود کو غالباً

غواصی کا مدمقابل سمجھا تھا۔ اس کے ایک قصیدے کے چند شعر یہ ہیں :-

مرا مکھ بھاگ لوچن لب تے پایا ہے موہن سندر
چلا سورج گلا چندر ستارہ جوت رنگ عنبر
نین گھائل ہے دل زخمی سو تن مجروح سینہ ریش
یو قد پر چھا فرنگ سو کا پلک کچھو ابھتوار نیز

سکی املی چتر سلطان عبد اللہ غازی سوں
کہ جگ آدھار جگ سنگار جگ جھلکار جگ پرور
مہا دانی مہا گیانی مہا بہا تر مہا جانی
بلند طالع بلند دانش بلند ہمت بلند اختر
دلیری ہور شجاعت کے پلے تعریف لکھنے کے
ملک کاتب فلک کاغذ قلم کہکش بدل مسطر
تجھ ایسے شاہ کوں ہونا سو وہی سار کا شاعر
پنڈت عاقل پنڈت کامل پنڈت گیانی پنڈت گنبھر
خدا ہور مصطفےٰ ہور مرتضےٰ ہور کل دلی دکھنے
ترے کوٹاں ترے شہراں ترے قلعے ترے کشور
دکھن میں شعر تھا افضل ولے ایسا نہ تھا حقا
تیا نرم تیا گرم تیا شیریں تیا دلبر

اسی دور میں ایک شاعر محب[۲۵] نے ایک مثنوی "معجزہ فاطمہ" لکھی جو سنہ ۱۶۷۷ء میں تکمیل کو پہونچی۔ اس شاعر نے بھی اپنی مثنوی کے آغاز

میں اپنے بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ کی ایک ایسی مدح لکھی ہے جو
اب تک کی پھیلائی ہوئی افواہوں کی تردید کرتی ہے کہ ابوالحسن تانا
شاہ ایک عیاش اور نا اہل بادشاہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور
میں یہ افواہ خود حیدرآباد تک پہونچ چکی تھی۔ چنانچہ اس شاعر نے دشمنوں
کی مخالفت کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی ابوالحسن کی تخت نشینی
کے پانچویں سال لکھی گئی تھی۔ چونکہ یہ مثنوی ابھی چھپی نہیں ہے اس لئے
اس کے چند شعر بطور نمونہ درج ہیں۔

کہ اے نامور قطب شاہ بوالحسن
عطا تجھ کئے پیر تخت دکن

توں پیتے ستی یادِ حق کی شراب
وندے کا ہے دل جل کے آگ پر کباب

تجھے پیر کا حق تے سایہ اہے
تو ہر کام میں فتح پایا اہے

تو ہے عدل میں آج نوشیرواں
سکیں عدل تج تے سگل خسرواں

سخاوت میں دیکھوں تو اے شہ تجے
توں حاتم تے افضل ہو دسے تجے

جو کوئی وندتج سوں کریں اختیار
تو وہ جوں ہے افراسیاب ... ار

ہوئے سرپوتن تیرے فرمان کول
نوازے اسے تو ہی بھومان سوں

سپاہی پیادے ترے تا مدار
کریں رج سوں ہر ایک کا رہزار
تو کیوں نا ہوے زیر تیر غنیم
جو اس دھات اچھے تیرے لشکر تے سیم
محمد حسینی دیئے تج کوں راج
مبارک اچھو تج کوں یو تخت و تاج

اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب غلام علی خاں لطیف[۳۹] قزلباش کا "ظفر نامہ محمد حنیف" ہے۔ یہ شاعر دراصل سپاہی پیشہ تھا۔ اور غالباً عبد اللہ قطب شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اب بوڑھا ہو کر خانہ نشین ہو چکا تھا۔ اسی بے کاری کے زمانے میں زوال سلطنت قطب شاہی سے صرف تین سال پیشتر سنہ ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں ایک بے مزہ سی مثنوی لکھی تھی۔ جس میں اس دور انتشار کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔ لطیف نے اس مثنوی میں اپنے خیالات اور سنہ تصنیف وغیرہ جس طرح درج کئے ہیں وہ ان کے چند اشعار سے ظاہر ہوں گے۔ اور ان سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کوئی اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں تھا۔

کہ فی الجملہ کر بولتا ہوں عیاں
مرتب کیا ہوں کہاں سوں بیاں
تھا جب دور سلطان شہ ابو الحسن
شہر حیدر آباد ان کا وطن

کیا جب سفرنامہ کا میں بیاں
مرتب کئے لگ سونا چپ رہنا
سنہ یک ہزار و نود پانچ پر
بنا کر مرتب کیا یو اچھر
قزلباش قرو نیلو آزاد ہوں
ولے زادۂ حیدرآباد ہوں
ہوں سلطان عبداللہ کے دور کا
شجاع اور سخا ہوں بڑے طور کا

غلام علی[۳۰] اس عہد کا ایک اور شاعر تھا جس نے فارسی سے ترجمہ کرنے کے عام رواج کو چھوڑ کر ملک محمد جائسی کی ہندی نظم پدماوت کا سنہ ۱۰۹۱ھ میں اردو ترجمہ کیا غالبًا اس جدت کا خیال خود ابوالحسن قطب شاہی کی تحریک پر پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ غلام علی اس بادشاہ کے مقربین میں سے تھا اور اس نے اپنی مثنوی میں اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اگرچہ یہ مثنوی ہندی پدماوت کا ترجمہ ہے لیکن اس میں ہندی کے الفاظ کم نظر آتے ہیں۔ غلام علی نے اپنے عہد کی فصیح اردو میں یہ کتاب مرتب کی ہے اور یہ محض ترجمہ نہیں ہے اس نے اصل پدماوت میں جگہ جگہ اضافہ کیا۔ اور ہر واقعہ کے آخر میں اپنی طرف سے شعری نتیجے بھی نکالے ہیں وہ اپنے پورے نام غلام علی ہی کو بطور تخلص استعمال کرتا تھا۔

ابوالحسن تانا شاہ کے آخر عہد میں فائز[۳۱] نے ایک مثنوی رضوان شاہ و روح افزا کے نام سے حیدرآباد میں سنہ ۱۰۹۴ھ میں مرتب کی تھی۔ یہ اس دور کی آخری بڑی کتاب ہے۔

شاہ قلی خاں شاہی[۳۲] حیدرآباد کا رہنے والا اور قطب شاہی لشکر کا ملازم تھا۔ رفتہ رفتہ ابوالحسن تانا شاہ کا مصاحب ہو گیا۔ اور اس کی زمینوں میں غزلیں لکھا کرتا تھا یہ شعر جو تانا شاہ کی نظم کا ایک ٹکڑا سمجھا جاتا ہے بعض تذکروں میں اس نام سے درج ہے ؎

ملنا تمن کا غیر سوں کوئی جھوٹ کوئی سچ بچھ کہتے
کس کس کا موں موندوں سجن کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

جب حیدرآباد فتح ہوا تو یہ لاپتہ ہو گیا۔ لیکن اہل حیدرآباد اس کے کلام کے حافظ تھے۔ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے اس کو ورد زبان کر لیا۔ اور بطور سوغات دور دور لے گئے۔ یہ اس دور کا بہترین مرثیہ گو بھی تھا۔ اس کے کئی مرثیے موجود ہیں۔

ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں جو شاعر باہر سے حیدرآباد آئے ان میں شجاع الدین[۳۳] نوری کا ذکر بھی ضروری ہے جو سادات گجرات سے تھا۔ یہ حیدرآباد میں سید مظفر وزیر تانا شاہ کے لڑکے کا اتالیق تھا۔ اس کی کوئی نظم تو نہیں ملی البتہ تذکرہ میر حسن وغیرہ میں ایک آدھ شعر اور بعض بیاضوں میں مرثیے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس وقت حیدرآباد میں کئی اور شاعر مثلاً قادر۔ مرزا۔ روحی وغیرہ بھی موجود تھے اور

چونکہ یہ زوال و تباہی حیدرآباد کے بعد بھی اس کا ماتم کرنے کے لئے عرصہ تک زندہ رہے اس لئے ان کا تذکرہ آئندہ عنوان "مغل عہد" کے تحت درج ہوگا۔

مغل عہد میں

۱۶۸۶ سے ۱۷۵۰ء تک

گیارہویں صدی ہجری کے آخری دو چار سالوں (یعنی ۱۶۸۵ سے ۱۶۸۷ء تک) میں دکن ... ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس نے اس سرزمین کی تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادیں ہلا دیں۔ بیجاپور اور حیدرآباد اس انقلاب سے متاثر ہوئے کہ پچاس سال تک سنبھل نہ سکے۔ سکندر عادل شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کی شکست اور قید کے بعد ان شہروں کی وہ مرکزیت ختم ہوگئی جو علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ ثابت ہوئی تھی چنانچہ سب سے آخر میں حیدرآباد کے لٹنے اور اجڑنے کے بعد ہی سے ایسے شاعر اور ادیب یہاں سے نکل گئے جو قدردانی کمال کی خاطر یہاں مقیم تھے۔ ان میں قاضی محمود بحری کا نام بطور خاص

قابل ذکر ہے جو گوگی کے رہنے والے ایک صوفی تھے۔ وہ اپنے وطن سے سنہ ۱۰۹۵/۵ ۱۶۸۳ء میں بیجاپور پہونچے ہی تھے۔ کہ اس شہر کا مغلوں نے محاصرہ کر لیا۔ اور آخر کار وہ اجڑ گیا۔ اس کی تباہی کے بعد انھوں نے حیدرآباد کا رخ کیا۔ لیکن ان کے قدم یہاں بھی منحوس ثابت ہوئے چنانچہ ان کے پہونچتے ہی مغل فوجیں حیدرآباد پہونچ گئیں اور اس کا بھی محاصرہ کر لیا جو آخر کار اس کی تباہی اور اجڑنے کا باعث ہوا۔

بحری بہت اچھے شاعر تھے ان کا اردو دیوان چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تصوف و عرفان سے متعلق کئی اردو فارسی مثنویاں من لگن سنہ ۱۷۰۰ء عروس عرفان وغیرہ لکھیں اور بیجاپور و حیدرآباد کے بحال تباہ بھاگنے اور راستے میں لٹ جانے کا حال بھی قلم بند کیا ہے۔

اس افراتفری میں بحری اور نوری جیسے نامعلوم کتنے شاعر حیدرآباد سے نکل گئے اور کسمپرسی کے عالم میں روپوش ہو گئے۔ لیکن بہت سے شاعر ایسے بھی تھے جو اپنے وطن چھوڑ کر کہیں جا ہی سکتے تھے۔ انھوں نے اس تباہ شدہ شہر میں ہی اقامت اختیار کی اور اس کی اور اپنی بربادی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے رہے اور چونکہ فاتح دکن شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی اور ان کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات و خیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے

تھے۔ اس لئے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے غمزدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ لکھ کر نکالی۔ یہ واقعہ یہاں بطور خاص قابل ذکر ہے کہ اہل حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ ابوالحسن کے آٹھ ماہ تک محصور رہنے اور جرأت و شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اس کے شریفانہ عادات اور تصوف و عرفان سے لگاؤ کی بناپر اس کو حضرت امام حسینؓ سے تشبیہ دینے لگے تھے چنانچہ اس شہر کے ایک بہادر سپہ سالار عبدالرزاق لاری نے اورنگ زیب کو یہ جواب دیا تھا۔

> "این جنگ بلاتشبیہ بجنگ کربلا می ماند۔ عبدالرزاق
> لاری امیدوار است کہ تا نفس باقی ست در زمرۂ
> کسانے کہ اول با حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ و
> السلام بیعت نمودہ آخر تیغ بر روئے آل شہید
> کربلا کشیدند در دنیا بد بلکہ منجملہ ہفتاد و دو تن سرخروئی
> دنیا و آخرت حاصل نماید۔"

غرض یہی وجہ ہے کہ زوال حیدرآباد کے بعد اس شہر کے اکثر شاعر جن میں زیادہ تر سنی المذہب تھے۔ مرثیہ گوئی ہی میں منہمک رہے اور طویل نظمیں یا مثنوی نہ لکھ سکے کیونکہ ان کے لئے ایک تو اطمینان قلب و فارغ البالی کی ضرورت تھی اور دوسرے کسی شاہی قدردانی یا درباری قدر و منزلت کی توقع۔ اور یہ سب باتیں اس دور انتشار میں مفقود تھیں۔ ایسے شاعروں میں سب

سے زیادہ مشہور اس شہر کے ایک پیر زادہ روحی تھے ان کے متعدد مرثیے مختلف کتب خانوں کی بیاضوں میں موجود ہیں۔ لیکن وہ محض مرثیہ گو ہی نہیں تھے انھوں نے غزلیں اور مخمس وغیرہ بھی لکھے تھے۔ جو اس عہد کی شاعری کا بہت عمدہ نمونہ ہے اس کے چند بند یہ ہیں۔

نس دن سجن تجھ درس کا آدھار ہوتا کاش کے
پل پل منیں ہے یہ مرن یک بار ہوتا کاش کے
جاتا ہمن مہ رخ کنے بسیار ہو تا کاش کے
واقف ہمارے حال پر دل دار ہوتا کاش کے
یو درد دل کا تجھ انگھیں اظہار ہوتا کاش کے

گر وصل تیرا اے سجن اچھتا سدا سینسار میں
دل شاد پھرتے عاشقاں تجھ حسن کے بازار میں
جلتا نہ پروانہ کہیں اس سوز کے آزار میں
زاری نہ کرتے بلبلاں اس درد کے گلزار میں
گلشن محبت کا اگر بیکار ہو تا کاش کے
پانا تمہاری خاک پا جگ میں ہماری آبرو
تیری برہ سوں اے سجن پھرتا ہوں حیراں کو بکو
پرواز دل کا تجھ انگھیں بولیا انا میں موبمو
صد جان اگر ہوتے مجھے تھی دل منے آرزو
یو جیو قرباں تجھ اوپر صد بار ہوتا کاش کے

میٹھے بچن سن پیو کے آتا ہے یوں مجھ من منے
روحی نہ ہوئے ایک تل جدا نس دن رہوں درشن منے
سن یو لطافت کے بچن طاقت نہیں سوسن سنے
ایسے سخن شیریں اوپر غنچے کے تئیں گلشن منے
تیری ثنا خوانی بدل گفتار ہو نا کاش کے

اس مخمس میں بھی جو سوز و گداز نمایاں ہے وہ اس عہد کے دکنی شعرا کے نفسی رجحان اور ذہنی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔ ان شعرا نے مرثیوں کو اپنے سیاسی جذبات کا آلہ کار بنایا تھا اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ بعض مرثیوں میں محض ایک آدھ لفظ کی تبدیلی سے ان شعرا کا اصل (یعنی تباہی دکن کی مرثیہ نگاری) ظاہر ہو جاتی ہے مثال کے طور پر روحی کا یہ ایک مرثیہ ہے۔

آج غمناک ہیں چمن کے گل
بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں
نرگس و نسترن یاسمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں
لہو میں ڈوبے ہیں سب [illegible] کے گل
نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا
سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گل

یہ صرف نام ہی کو ایک مرثیہ ہے اور اگر اس کے پہلے مصرعہ میں جانے چمن کے دکن لکھ دیا جائے تو پورا مرثیہ بجائے امام حسین کے ابوالحسن کا مرثیہ بن جاتا ہے

روحی زوال حیدرآباد کے وقت کا ایک بڑا شاعر تھا وہ سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۶ء کے قریبی زمانے میں فوت ہوا۔ اس کے کلام کی شہرت دور دور پہونچ چکی تھی۔ چنانچہ برہانپور کے ایک مشہور مرثیہ گو ہاشم علی نے اپنے دیوان حسینی میں اس کی نسبت لکھا تھا ؎

ہزار حیف نہیں شاعران دکھن
سو روحی و مرزا و قادر نہیں

قیام الدین قائم نے بھی اپنے تذکرہ میں روحی کا ذکر کیا ہے۔ ہاشم علی اس دور کا ایک بڑا شاعر تھا۔ جس کا دیوان حسینی" دکنی طرز سخن کا ایک معیاری مجموعہ ہے جو سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۶ء میں مرتب ہوا تھا۔

ہاشم علی نے روحی کے بعد مرزا کا نام لکھا ہے۔ اس نام کے دو شاعر دکن میں گزرے ہیں۔ ایک بیجاپور میں اور ایک حیدرآباد میں۔ لیکن ہاشم علی نے اس شعر میں جن تینوں شاعروں کے نام لیے ہیں وہ سب حیدرآباد کے تھے بیجاپور کا مرزا سنہ ۱۰۸۳ ہجری سے قبل فوت ہو چکا تھا اور یہ مرزا ابوالحسن تانا شاہ کا درباری شاعر تھا۔ جب تانا شاہ کو قید کر لیا گیا اور حیدرآباد کو مغل فوجوں نے لوٹ لیا تو مرزا

نے اس غم میں فقیری اختیار کرلی اور گوشہ نشین ہوگیا اسی گوشہ نشینی کے زمانے میں اس نے مرثیے لکھ کر اپنا غم غلط کیا۔ اس کے متعدد مرثیے ایڈنبرا یونیورسٹی اور حیدرآباد کی بیاضوں میں موجود ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اس کے ایک مرثیہ کے چند شعر یہ ہیں :-

یہی نہ منتہا لباس نیلا ہے سب محبان کے تن میں غم تھیں
سیاہ پھیرا ہے پتلیاں نے ازل سوں جگ کے نین میں غم تھیں
ملا تھا بلبل سوں ہیں سحر کہ سنا ہوں احوال گلستاں کا !
نہیں ہے کوئی گل بغیر نرگس ولے ہے گریاں چمن میں غم تھیں
خطا کا احوال مشک کہتا ہے جب سوں پہونچی ہے یہ خبر وہاں
ہوا ہے سودا سوں جل کے کالا لہو غزال ختن میں غم تھیں
خبر محباں کی اشک ریزی کی جب بدخشاں سوں گئی عرب میں
عقیق جیتے تھے سب لہو ہو کے بہہ چلے ہیں یمن میں غم تھیں
یہ مرثیہ بوتراب سنتے قبول پائے تو کچھ عجب نئیں !
کہ روح قادر کی زار روئے پڑے جو مرزا دکھن میں غم تھیں

مقطع میں مرزا نے اپنے جس مرحوم رفیق خلیفہ قادر کو یاد کیا ہے وہ بھی حیدرآباد کا ایک شاعر عبدالقادر یا غلام قادر تھا جس کا ذکر قائم نے بھی تذکرۂ مخزن نکات میں کیا ہے۔ اس کے بیس پچیس مرثیے ایڈنبرا اور حیدرآباد کی بیاضوں میں موجود ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری نے اس کو دکن کا بڑا شاعر مانا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

ہاشم علی عجب نئیں اس مرثیہ کوں سنکر
تجھ پر فلیعہ قادر تحسیں کرے دکھن میں

قادر کے مرثیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علم نجوم و ہندسہ کا بھی ماہر تھا۔ اس کے اسلوب بیان میں جوش اور سوز کے ساتھ سادگی اور تازگی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ سنہ ۱۱۴۹ھ/۱۷۴۵ء تک زندہ تھا۔ چنانچہ اپنے ایک مرثیہ میں اس کا سنہ تالیف اس طرح درج کیا ہے کہ گویا اپنی موت کا بھی اس سال خواہشمند ہے وہ کہتا ہے۔

سنہ اگیارہ سے اوپر اونچاس سال
سبز بانا قادرا کا لہو میں لال
ختم کریو مرثیہ پایا وصال
ہائے کیا غم ہم پہ غم ہے مستقیم

اس کا سنہ وفات معلوم نہیں لیکن کیا تعجب کہ اپنی خواہش کے مطابق اسی سال واصل بحق ہوا ہو۔

اس دور میں چند شاعر اور ادیب ایسے بھی ملتے ہیں جنہوں نے رفتہ رفتہ اس انقلاب کے تلخ اثرات سے اپنی گلو خلاصی کرلی اور خود کو زمانہ کے ہم رنگ بنالیا۔ ان میں سب سے پہلے شیخ داؤد ضعیفی قابل ذکر ہیں۔

ضعیفی ایک عالم فقیہہ تھا۔ اس نے سنہ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۸ء میں ایک ضخیم کتاب "هدایات هندی" منظوم کی تھی جس میں جملہ شرعی مسائل کو ۱۵ ابواب میں منقسم کرکے بیان کیا ہے ہر باب میں

کئی مضامین ہیں۔ یہ کسی عربی یا فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اسی موضوع کی عربی و فارسی کتب کو پیش نظر رکھ کر خود ضعیفیؔ نے ایک نئی کتاب اردو میں مرتب کی ہے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ "یہ زبان آج کل اس حصّہ ملک میں بہت مقبول ہے اور شوق سے پڑھی جاتی ہے"

اس مثنوی کے آخری باب کی تیسری فصل میں ضعیفی نے بادشاہ وقت کی یوں مدح کی ہے۔

یہ دور جہاں دار اورنگ زیب
کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب

شہنشاہ عادل اہے درا مور
کہ بدعت ضلالت ہوا جس سے دور

دیا یوں اسے حق تعالیٰ نے جس
جو دشمن ہوئے اس انگے فار و خس

دیا سر پو چھپن شہی کا دو تاج
دلی ہور دکن کا ہوا ایک راج

عجب فتح و نصرت ہے اس کے سنگاتے
جو کوئی نبئیں کیا اس سوں دعویٰ کی بات

کہ شاہاں بھی اول ہوئے ہیں تو کیا
نہ کوئی زہد و تقویٰ میں ایسا دسیا

اہے اس منے بھی ہوی کی صفات
کہ ہو آئے جو مول سوں کالے سو بات

بڑا دین اسلام کا کارساز
الٰہی تو کر عمر اس کی دراز

یہ پہلی مدح ہے جو کسی حیدر آبادی شاعر نے اورنگ زیب کی لکھی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضعیفی ایک مذہبی شخص تھا اور اس کی نظر میں اورنگ زیب ایک بادشاہ کے علاوہ ولی بھی تھا۔ اس لئے کہ وہ جو بات منہ سے نکالتا تھا وہ پوری ہوتی تھی۔ اس مدح کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ ایک دکنی شاعر نے اس فاتح کی پہلی بار تعریف کی ہے جس کی ہجو میں اس سے پہلے کے شعرا خاص کر نصرتی نے متعدد شعر لکھے ہیں۔

شیخ داؤد ضعیفی کی ایک کتاب بھی موجود ہے جس میں ۳۶۰ ابیات میں ایک عورت کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو حضور سرور کائنات کی محبت میں بے تاب ہو کر جل گئی۔ یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ ضعیفی ایک عالم ہونے کے ساتھ ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی ہدایات ہندی اس دور کی ایک ضخیم (۳۶۳۸۰ ابیات کی) اور عمدہ کتاب ہے۔ اس میں جگہ جگہ آیات قرآنی، احادیث اور عربی اور فارسی کی مستند کتابوں کی عبارتیں درج کرکے ان کے منظوم ترجمہ لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اسلامی فرائض اور شریعت کے مسائل پر ایک مستند تصنیف ہے۔

ضعیفی کے ایک اور ہم عصر شاہ عنایت تھے جنہوں نے

سنہ ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں ایک مثنوی نورنامہ لکھی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد سے تھے اور حسین شاہ ان کے مرشد یا والد تھے انھوں نے فارسی نثر میں نورنامہ پڑھا تو خیال کیا کہ اپنی یادگار کے طور پر اس کو منظوم کر دیں۔ یہ کتاب اصل میں حضور سرور کائنات کی نعت پر مبنی ہے اور چونکہ مصنف کوئی اچھا شاعر نہ تھا اس لئے اس مثنوی کی صرف مذہبی اہمیت ہی ہے۔ شاہ عنایت چونکہ ٹاٹ کا جبہ پہنتے تھے اس لئے ٹاٹ شاہ مشہور ہوئے۔ سنہ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں وفات پائی اور حیدرآباد سے جو راستہ جامعہ عثمانیہ کی طرف جاتا ہے اس پر ان کی درگاہ اڈیکمیٹ کے قریب موجود ہے۔

شاہ عبد الرحمٰن قادری ایک بیجاپوری شاعر تھے جو بحری کی طرح بیجاپور کی تباہی کے بعد اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور برار کا رخ کیا۔ حسن اتفاق سے اورنگزیب عالمگیر بادشاہ کے فرزند اور جانشین شاہ عالم بہادر شاہ کے مقربین میں کچھ دن شامل رہے اور پھر دربار چھوڑ کر دلی کا سفر کیا اور وہاں کے قیام کے زمانے میں روز جمنا کی سیر کو جاتے۔ وہاں تماشائیوں میں ایسے فقیر بھی دیکھے جو امام حسینؑ کے حالات درد انگیز فارسی اشعار میں سناتے تھے۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ دکنی میں اس موضوع پر سنہ ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۷ء میں ایک مثنوی لکھنی شروع کی جس کا تاریخی

نام باغ حسینی جو (۱۶۰۰) سے زیادہ ابیات پر مشتمل ہے لکھی اُس کے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی زبان اس وقت نہ صرف دکن بلکہ شمالی ہند میں بھی مقبول تھی۔ یہ دکن کی آخری طویل مثنوی ہے جو سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی کتب خانہ خانقاہ عنایت الٰہی حیدرآباد میں محفوظ ہے۔

اس مثنوی میں رحمان قادری نے شہر بیجاپور کا بڑا دردناک مرثیہ لکھا ہے اور اپنے وطن کے ایک بڑے شاعر نصرتی کی طرح اورنگ زیب کی سخت مذمت کی ہے اور اس کی حیلہ جو طبیعت پہ چوٹیں کی ہیں۔ بیجاپور کے مرثیہ کی چند ابیات یہ ہیں۔

جو اس وقت میں تھا بیجاپور شہر
سو اس شہر کی تھی جہاں میں خبر

اتھے بادشاہ واں کے صاحب عدل
نہ تھا یک رتی کام کا کیں دخل

جتی خلق واں کی وضیع و شریف
ستی مہ یاں ہور بھو تیج لطیف

نبر تھے سب چھند فریباں
اتھے معتقد وہ فقیر ساں ستے

جو آویں بزرگاں مرے شہر میں
رکھیں کر وطن اپنا آرام میں

اتھا نام اس شہر کا ہر دیار
تو آویں خبر سن کے عالم اپار
خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا
اسی کے کرم سوں وہ منصور تھا
ہوئے بادشاہ جب سوں اورنگزیب
کئے اس کے لینے کے تئیں کئی فریب
دیئے بھیج فوجاں کو اول عتاب
جو جا کر کریں ملک سارا خراب
پچھیں آپ آ ایک حیلے ستے
لئے شہر ہور ملک سب غصب تھے

اس عہد کا ایک بڑا شاعر سید محمد خاں عشوقی تھا جو اپنی خاندانی وجاہت اور لیاقت کی وجہ سے شہنشاہ اورنگ زیب کی سرپرستی سے فیض یاب ہو سکا۔ اس کا خاندان سادات درویش کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد سید یوسف حسینی ولد سید حسین کے ساتھ بصرہ کے راستہ سے دکن پہونچا اور پہلے بیجاپور میں مقیم ہوا اور بعد کو حیدرآباد چلا آیا شاہ راجو کی جاگیرات وغیرہ کے سلسلہ میں اس کے اور اورنگ زیب کے درمیان مراسلت رہی۔ اس کے پانچ لڑکے تھے اور سب ہی علمی ذوق سے بہرہ مند تھے۔ خاص کر سید احمد خاں اور سید محمد تقی خاں صاحب تصنیف تھے

ان کا خاندان حیدرآباد میں موجود ہے۔ عشرتی کی قبر شاہ راجو کے گنبد (واقع بیرون فتح دروازہ حیدرآباد) کے شمال کی طرف واقع ہے۔

عشرتی فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا ادیب تھا۔ اس نے سنہ ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۷ء میں ملک محمد جائسی کی ہندی پدماوت کا خلاصہ فارسی مثنوی کی شکل میں لکھا تھا اور اس کی تاریخ اس طرح نکالی تھی۔

بہار افروز دل شد چوں کلامش
گلے خستی ست تاریخ تمامش

عشرتی نے اردو دیوان غزلیات کے علاوہ دو مثنویاں لکھی تھیں۔ دیپک پتنگ اور رچت لگن جو بہت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ دیپک پتنگ ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء میں لکھی تھی۔ عشرتی کو اس کے معتقدین نصرتی بیجاپوری کا مدمقابل سمجھتے تھے۔ عشرتی کے فرزند سلیل احمد خاں ہنر نے بھی اپنے باپ کی طرح کئی مثنویاں لکھی تھیں۔ جن میں یہ درپن بہت مشہور ہے جو سنہ ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۰ء میں تمام ہوئی تھی یہ پھول پن کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

بنایا پھول بن ابن نشاطی !
منھی باس اس کی سب کے تئیں خوش آتی
جواب اس کا جو یہ ہے نیہ درپن
ہے سچ وہ عشق کے انکھیاں کا انجن

اسے اس سے اگر نا پائے بہتر
برابر تو یقیں جانے نہ کمتر

گویا خود کو وہ ابن نشاطی کا مدمقابل سمجھتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے اس پیش رو کے مقابلہ میں اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا تھا۔ ابن نشاطی کی طرح اس کا ادبی ذوق بھی بہت عمدہ تھا۔ ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کی طرح عشرتی اور اس کے فرزندوں نے بھی اپنی جملہ کتابوں کے نام ٹھیٹ ہندی میں رکھے تھے۔ نیہ درپن میں ایک دعوت کا سماں بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی عہد کے آخری دور میں بلکہ اس کے بعد بھی اہل حیدرآباد اپنی مجلس آرائیوں میں سلیقہ اور شائستگی سے کام لیا کرتے تھے اس حصے کے چند شعر یہ ہیں:-

بچھائے چاندنی کا فرش نرمل
کہ جیسا چاندنی میانے صفا جل

بچھائے سوزنیاں زرباف کی صاف
ہے اس گل سورج بلبل کو انصاف

روپیری اور سبزی مسنداں پر
صدر ٹھہرے ہے جیوں سور و چندر

اتھے پر دار تکیے پر نیاں باف
پریاں کے گال جیسے نازک ہو صاف

سرنگ اسماں گیریاں تھیں شفق سی
اتھی گلزار جیوں گھن کے طبق سی
رکھے پھولاں سوں بھر اس ٹھار گلدان
رکھے تھے پان سیتے بھر تنبول دان
جڑت کے شمع داں میں شمع کافور
نوے چندیتوں لگن میں گھن کے پرنور
قندیلاں کے دکھت جھمکے سہانے
انگوراں کے جھڑے خوشاں کے دانے
دیویاں سوں کٹ گرے ایسے سنوارے
کہ جیوں قوس قزح میانے ستارے
طبق بلور کی خوشبوی سوں بھر
ہزاروں چاند تھے جیوں بھیں کے اوپر

اسی سلسلے میں اس وقت کے کھانوں سالنوں اور میٹھوں کی تفصیل نہایت خوبی سے قلم بند کر دی ہے۔

عشرتی کے پوتے سید علی[11] نے بھی حاتم طائی کا قصہ سنہ ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء میں گلشن احسان، کے نام سے منظوم کیا تھا۔ اور اس نے اپنے دادا کو نصرتی کا مدمقابل قرار دیا ہے۔

عشرتی کے ہم عصروں میں بیچا[12] دکھ۔ انداد[13] اور واللہ[14] کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ جو قطب شاہی عہد کے آخری شعرائے اردو میں سے تھے۔ اول الذکر عالمگیر اورنگ زیب بادشاہ کے زمانے میں بھی حیدرآباد میں موجود

تھے۔ ان میں سے بیچارہ اور آزاد نے تو فتح حیدرآباد کے بعد دلی کا بھی سفر کیا تھا۔ ان کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے۔ فقیر اللہ آزاد خاص حیدرآباد کے باشندے اور بڑے اچھے اردو کے شاعر تھے وقی اورنگ آبادی نے ان کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں اور ان کے کلام کی داد دی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وقی لکھتے ہیں۔

آزاد سے سینا ہوں یہ مصرعۂ مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا پورا شعر یہ ہے ؎

سب صنعتیں جہان کی آزاد ہم کو آئیں
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

سید محمد وآلہ نے سنہ ۱۷۳۷ء میں حیدرآباد میں ایک طویل مثنوی طالب و موہنی لکھی تھی جو ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ [۱۵]

بحر العرفان سید شاہ حسین ذوقی اس دور کے ایک ایسے مذہبی بزرگ تھے جنھوں نے شعر و سخن کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں سے وصال العاشقین۔ وفات نامہ۔ غوث نامہ اور ماں باپ نامہ قابل ذکر ہیں۔ وہ اتنے کہنہ مشق شاعر تھے اور ان کے اتنے قدردان تھے کہ انھوں نے خود کو نصرتی سے بلند پایہ شاعر قرار دیا ہے۔ انھوں نے

مرثیے بھی لکھے ہیں۔ جو اس دور کے بڑے مرثیہ گو روحی کے ہمرنگ ہیں۔ ایک مرثیہ کے چند شعر یہ ہیں۔

اے شمع بزم مصطفےٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے تم بن جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں
وہ جاہل دوزخ وطن آتے ہیں با دل کے تمن
جوں برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں
چھوڑ دسگل دنیا کے کام دس دن تلک ہر خاص وعام
ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلاتے کیوں نہیں
ذوقی تمہارا ہے غلام فضل وکرم سے یا امام!
اپنی زیارت کو مدام اس کو بلاتے کیوں نہیں

شاہ[۱۴] میر اللہ نجومی دراصل بیجاپوری شاعر تھے جو زوال بیجاپور کے بعد بھی زندہ رہے اور شعر و شاعری میں مصروف رہے۔ انھوں نے وجہی کے مشہور شعری قصے سب رس کو منظوم کیا ہے۔ یہ مثنوی گلشن حسن و دل کے نام سے سنہ ۱۱۱۴ھ ۱۷۰۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کا اسلوب سلیس اور سادہ ہے۔

بلبل[۱۵] بھی اسی دور کا ایک شاعر تھا جس نے آتشی بیجاپوری کی فارسی مثنوی چندر بدن و ماہیار کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ مثنوی مقیمی کی اسی موضوع کی مثنوی سے بالکل جدا ہے

عبد[۱۶] العلی داجی نے سنہ ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء میں ایک مثنوی

نامہ علی قلم بند کی جس میں داستان کے طور پر حضرت علیؓ کے کمالات بیان کئے ہیں۔

دریا[19] نے سنہ ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰ء میں ایک وفات نامہ مثنوی کی شکل میں مرتب کیا جو دکن کے اکثر شہروں میں بہت مقبول رہا اور اب تک بعض جگہ پڑھا جاتا ہے۔

عبدالمحمد[20] ترین غالباً کوئی افغانی الاصل دکنی شاعر تھا جس نے اس دور میں پشتو زبان کی ایک کتاب شمائل النبی کو دکنی میں منتقل کیا تھا۔

وجہ الدین وجدی[21] اس دور کے بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ جو دھارور کے رہنے والے تھے۔ ان کی تین مثنویاں موجود ہیں۔ پنچھی باچھا۔ تحفہ عاشقاں اور مخزن عشق پنچھی باچھا (۳۶۵۰ شعر) شیخ فریدالدین عطار کی مشہور فارسی مثنوی منطق الطیر کا آزاد ترجمہ ہے اور سنہ ۱۱۳۱ھ/۱۸-۱۷۱۸ء میں لکھی گئی ہے۔ تحفہ عاشقاں بھی عطار ہی کی ایک مثنوی خسرو نامہ کا دکنی ترجمہ ہے۔ جس میں وجدی نے بہت اضافہ کیا ہے یہ مثنوی سنہ ۱۱۵۳ھ میں لکھی گئی۔ تیسری مثنوی مخزن عشق باغ جہاں فزا بھی کہلاتی ہے۔ اور یہ سنہ ۱۱۴۵ھ/۳۱-۱۷۳۲ء میں تصنیف کی گئی۔ اس شاعر کے حالات زندگی پر ایک کتاب مرتبہ محمد بن عمر صاحب شائع ہو چکی ہے۔ اس شاعر نے اپنے دور کے تمدن اور سماجی حالات کی ایک کامیاب عکاسی کی ہے۔ اس کی زبان سلیس اور ترقی یافتہ ہے۔

اس نے غزلیں بھی لکھی ہیں ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں :۔

چنچل کا آج بچھڑا مجھ آپر بھاری ہوا یاراں
تو ہیں اس دو جگت ستیں نہ آدھاری ہوا یاراں
ہماری بت پرستی کوں نہیں سمجھے اجھوں زاہد
برائے کفر سٹ دیں کو تو پوجاری ہوا یاراں
نکو کہہ وجد یا اپنیاں نپٹ سب وصل کیا تایاں
کہتے ہیں لوگ سب تجھ کوں کہ زناری ہوا یاراں

فتح[۲۲] شریف نے اس دور میں دو مثنویاں زلیخائے ثانی اور پند نامۂ لقمان سنہ ۱۱۳۰/۱۷۱۷ء لکھیں۔ یہ شاعر فتح تخلص کرتا تھا۔ اور گوڈر کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست محمد امین کی فرمائش پر مثنوی زلیخائے ثانی لکھی تھی اس کی دونوں مثنویاں فارسی کا ترجمہ ہیں

شاہ[۲۳] عبداللہ عاشق اورنگ آبادی شاعر تھے اور وہاں کے مشہور بزرگ نظام الدین ثانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ایک طویل مثنوی اشارات الغافلین لکھی جس میں اخلاق و تصوف کے مضامین قلم بند کئے انھوں نے اپنے مرشد کی تعریف میں جو ابیات لکھی ہیں ان کا انتخاب یہاں درج کیا جاتا ہے تاکہ ان کی اور حیدرآباد کے ان شاعروں کی زبان کا فرق واضح ہو جنھوں نے وہاں کے ایک مرشد شاہ راجو کی مدحیں لکھیں تھیں اور جو اس سے قبل

درج ہو چکی ہیں۔

کیا پیر پر میں اپس کوں فدا
ادھے بادشاہ میں ہوں اس کا گدا
مگر پیر میرا سو ایمان ہے
کہ ایمان کیا بلکہ رحمان ہے
نظام الدین ثانی ہے ثانی علی
بتایا مجھے ان خفی ہور جلی
ولی چشت کے گھر کا ہے جس پو بار
کہ عالم ہے اس فیض کا انتظار
تصدق ہوں بلہار اس پیر کے
نظام الدین ثانی سے اکسیر کے

سید اشرف[۲۴] اس دور کے ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے شمالی ہند کا سفر کیا اور دلی میں بھی اتنی مقبولیت حاصل کی کہ ان کا اکثر تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے انھوں نے سنہ ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں ایک مثنوی "جنگ نامہ حیدری" لکھی تھی جس میں حضرت علیؓ کے حالات جنگ تفصیل سے منظوم کئے ہیں۔ انھوں نے متعدد مرثیے بھی لکھے ہیں جن میں سے ایک مرثیہ کے چند شعر بطور نمونہ یہاں درج ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ سفر دھلی کے اثر سے ان کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور اضافوں کا کس طرح دخل ہو گیا تھا ؎

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسن میرا
کہاں ہے وہ حسین ابن علی صفدر شکن میرا
اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا
برنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا
لگا ہے بسکہ تیر ماتم شہ دل منے کاری
شہید کربلائے غم ہوا ہے جگ میں من میرا
ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل
محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا
ہوا ہے بسکہ زخمی خنجر داغ غم شہ سوں
برنگ لالہ ہے لبریز خون دل چمن میرا
کہیا ہوں بے بدل یوم شبیہ حبیب سوں اماموں کا
ہوا مشتاق ہر یک شاعر ملک دکھن میرا
جو کوئی ہے صدق دل سوں دوست دار آل پیغمبر
اے اشرف اسکے پگ کی خاک ہے کحل نین میرا

شیخ[۲۵] محمد فراقی ۔ یہ ایک بیجاپوری شاعر تھے۔ زوال بیجاپور کے بعد پہلے اورنگ آباد آئے اور پھر آزاد کے ساتھ دلی کا سفر کیا اور وہاں اتنی شہرت حاصل کی کہ وہاں کے تذکرہ نگاروں نے ان کا بطور خاص ذکر کیا ہے انھوں نے مضامین تصوف پر مشتمل ایک مثنوی مراۃ الحشر بھی لکھی تھی لیکن غزل گو کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئے ان کی غزلیں دلی میں اردو شاعری کا چسکا پیدا کرنے کا باعث

بیس۔ ایک نعتیہ غزل کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

رہتے ہیں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
محمد کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا

ازل کی دین ہیں یارب اگر مفلس بھکاری ہوں
نبی کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا

نظر ہے علم منطق ہو رمعانی میں فراقی کوں
اگر علم حدیث مصطفےٰ ہوتا تو کیا ہوتا

سید شاہ ندیم اللہ حسینی بھی بیجاپور کے باشندے تھے۔ اور وہاں کے دوسرے شاعروں رحمن اور فراقی کی طرح زوال بیجاپور کے غم میں عمر بھر دل برداشتہ رہے اور زیادہ تر مرثیے لکھ کر غم غلط کرتے رہے۔ ان کے مرثیے بہت مشہور ہیں۔ ایک مرثیے کے چند شعر یہ ہیں۔

ہے ہے اصغر ابن حسین سونا تیرا پالنا
رو رو بانو کرتے ہیں بین سونا تیرا پالنا

تھا توشہ کے من کا چاؤ مجھ دکھیا کے من کا بھاؤ
کاری ہے مجھ دل پر گھاؤ سونا تیرا پالنا

چھاتی کوں کس لاؤں میں کس کو دودھ پلاؤں میں
اصغر تجھ کاں پاؤں میں سونا تیرا پالنا

دکھ کی کنٹھا پہنوں تن غم کی دھونی جالوں من
تجھ بن مجھ کوں گھر ہے بن سونا تیرا پالنا

آج ندیم اس غم کے بین کرتا انجھواں بھر کر نین
اصغرشہ کے نورالعین سوتا تیرا پالنا

ولی[۲۷] ویلوری کا نام میر ولی فیاض تھا۔ پہلے سات گڑھ کے نواب حراست خاں کے ملازم رہے اور بعد کو قلعہ داران سدھوٹ سے متعلق ہوگئے۔ اور اپنی جاگیر چٹ پیٹہ میں آخری عمر گزاری۔ وہ بہت پر گو شاعر تھے اور کئی مثنویاں لکھیں جو زیادہ تر مذہبی موضوعوں پر ہیں۔ ان کی حسب ذیل مثنویاں اب تک مشہور ہیں۔

۱۔ روضۃ الشہدا جو سنہ ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں لکھی گئی اور ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ یہ دہ مجلس بھی کہلاتی ہے۔ امام حسینؓ کی شہادت کے حالات اس میں دس مجلسوں کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔

۲۔ روضۃ الانوار سنہ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۵ء میں آنحضرتؐ کی سیرت کے حالات سے متعلق لکھی گئی۔

۳۔ روضۃ العقبیٰ۔ سنہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء میں لکھی تھی۔

۴۔ دعائے فاطمہ۔ بھی اسی زمانے میں لکھی۔

۵۔ مثنوی رتن پدم میں رتن سین اور پدماوت کا قصہ لکھا ہے اور یہی مثنوی غالباً ان کی ابتدائی تصنیف تھی اور اس کی کامیابی کو دیکھ کر بعد میں انھوں نے مذہبی مثنویاں لکھیں۔

ولی اللہ قادری[28] نے سنہ ۱۶۸۸ء میں اپنے والد کی فرمائش پر فارسی معرفت السلوک کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

امامی[29] بھی اس دور کا ایک شاعر تھا جو پرانی دلی کے ایک بزرگ شاہ عبداللہ خواہر زادہ پیر سید جلال کا مرید تھا اور غالباً دلی کا سفر بھی کیا تھا۔ اس نے متعدد مرثیے بھی لکھے تھے جن میں سے آٹھ اڈنبرا یونیورسٹی کی بیاض میں محفوظ ہیں۔ اس نے سنہ ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء میں وفات نامہ سرور کائنات لکھا تھا جو ۵۱۵ ابیات پر مشتمل ہے۔ اس میں امامی نے اپنے مرشد کی تعریف جس عنوان کے تحت کی ہے اس کے چند شعر درج ذیل ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اس سے پہلے کے دکنی شاعروں نے اپنے مرشدوں شاہ راجو وغیرہ کی جو مدحیں کی ہیں۔ ان کی اور امامی کی زبان اور اسلوب میں کتنا فرق پیدا ہو چکا تھا۔

حقیقت کے میدان منے شہسوار
محل معرفت راز کے تاجدار
کہ ہیں دو نگینے سلیمان کے
مہر ہیں محمد کے فرمان کے
دونا اک رسالت ولایت کے ہیں
دو ہادی حقیقت ہدایت کے ہیں
مبارک اسم میر سید جلال
کہ دلی پرانی میں ان کا محال
اسی کے بہن کا جو فرزند ہے

کہ دل ٹوٹیاں کا وہ دلبند ہے
مرا تن مرے پیر کے تن منے
مرے پیر کا تن محمد منے

سید ولی محمد ولی اورنگ آبادی۔ اس پورے دور کے گل سرسبد تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر غازی کے طویل قیام دکن اور سکونت اورنگ آباد کا اگر کوئی بہتر اور قابل فخر نتیجہ نکل سکا۔ تو وہ صرف ولی اور ان کا کلام ہے اورنگ زیب نے بیجاپور و حیدرآباد کو تو اجاڑ دیا اور وہاں کی ادبی محفلیں اور بازار اردو کی چہل پہلی سونی ہوگئی۔ لیکن اس کی وجہ سے اورنگ آباد شعر و ادب۔ علم و فن اور تہذیب و تمدن کا ایک ایسا مرکز بن گیا جو اس کی وفات کے بعد بھی تقریباً ایک صدی تک درخشاں رہا اس وقت اورنگ آباد پورے ہندوستان کا دل تھا اور ہر صوبہ کے امیر۔ فقیر سپاہی اور ادیب شاہی دربار سے فیض یاب ہونے کے لئے وہاں آتے تھے۔ خود بیجاپور اور حیدرآباد کے متعدد باقی ماندہ شعرا اور صاحبان کمال بھی وہیں کھنچے چلے گئے تھے ایسے سازگار ماحول میں ولی کی نشو و نما ہوئی اور چونکہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنت کی تباہی کے بعد دکن میں علم و فضل کا کوئی مرکز باقی نہ رہا تھا اور اورنگ زیب کی لشکر آرائیوں کی وجہ سے خود اورنگ آباد میں اس وقت تک یہ مرکزیت پیدا نہ ہونے پائی تھی۔ اس لئے تکمیل تعلیم کے

لئے ولی نے احمد آباد گجرات کا سفر کیا اور وہاں کے مشہور بزرگ شاہ وجیہہ الدین گجراتی کی خانقاہ اور مدرسہ ہدایت بخش سے فیض حاصل کیا۔ ان کا یہ قیام گجرات کا زمانہ چونکہ عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کے اس شگفتہ دور کو تمام عمر یاد کرتے رہے اس سیر گجرات کی دلچسپیوں گجراتی دوستوں کی محبت و جاں نثاری اور مولانا نورالدین اور ان کے فرزند شیخ محمد صالح کی مدح سرائی کی وجہ سے بعض اصحاب کو یہ خیال ہوا کہ ولی گجراتی الاصل ہی تھے۔ حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ انھوں نے گجرات پر جو نظم لکھی اس میں وہاں کی سیر کا صاف طور پر ذکر کیا ہے۔ اور جگہ جگہ خود کو شاعر دکن ظاہر کیا ہے۔ ان کی زبان بھی گجراتی لب و لہجہ اور لسانیاتی خصوصیات سے عاری ہے۔

ولی عہد اورنگ زیب کے ایک سچے نمائندے تھے۔ خود اورنگ زیب اپنے وطن دلی اور آگرہ سے دور تمام عمر دکن کے کوہساروں میں سرگرداں رہے اور ان کے ساتھ تمام ہندوستان کی فوجیں اور ارباب کمال متحرک رہے۔ اس لئے ولی کا بھی ایک جگہ بیٹھا رہنا اقتضا ئے وقت کے خلاف تھا۔ یہ دور دراصل ایک دور انتشار تھا چنانچہ اس عہد کے اکثر دکنی شعرا بحری۔ آزاد۔ فراقی۔ وجدی نوری۔ اماتی۔ رحمن وغیرہ برابر حرکت میں رہے اور ان

میں سے اکثروں نے دلّی کی بھی سیر و سیاحت کی۔ چنانچہ ولی نے بھی دلّی کا سفر کیا اور وہاں کے مشاعروں میں اپنا دکنی کلام سناکر وہاں کے شاعروں کو اتنا مسحور کیا کہ وہ اردو میں لکھنے کی طرف مائل ہوگئے۔ اس وقت تک وہاں یہ زبان صرف بازاری سمجھی جاتی تھی۔ اور علمی و ادبی محفلوں میں اس وقت تک اس کو جگہ نہ مل سکی تھی۔ ولی کی شخصیت اور ان کے دیوان کی مقبولیت کا یہ اثر ہوا کہ شعرائے دلّی نے فارسی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اردو میں طبع آزمائی شروع کردی حاتم۔ مظہر۔ آبرو۔ ناجی اور فغاں وہ شعرائے دلی ہیں جنھوں نے ولی کا کلام خود ان کی زبان سے سنا اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اور اپنے کلام کے لئے وہ محاورہ اور زبان اختیار کی جو ولی نے استعمال کی تھی۔ اگرچہ بعد کو مظہر کی تحریک سے دہلی کا روزمرہ اور فارسی ترکیبیں زیادہ استعمال ہونے لگیں۔ لیکن میر اور سودا اور درد کے زمانے تک ولی ہی کا سکہ چلتا رہا۔ اس طرح اس زمانے میں اگرچہ شمالی فوجوں نے دکن کو فتح کیا تھا۔ لیکن دکن کے شاعروں نے شمال کو فتح کرلیا۔ اور اپنی زبان کا ڈنکا دلّی کے مشاعروں اور محفلوں میں اس طرح بجوایا کہ دکن کی بھی زبان وہاں کی محفلوں کی جان بن گئی۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک عجیب ستم ظریفی یہ ہوئی کہ شمالی ہند کے شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے ولی ہی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان

شاعر سمجھ لیا اور اب تک بھی یہی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ دکن میں ولی سے بہت پہلے متعدد شاعر مثلاً محمد قلی قطب شاہ غواصی وجہی۔ عبداللہ قطب شاہ سلطان۔ علی عادل شاہ۔ ہاشمی نصرتی وغیرہ۔ صاحب دیوان گزر چکے ہیں۔ اور انہی کی زمینوں میں ولی نے اپنی غزلیں لکھی ہیں۔ وہ اس قدیم سلسلہ شعرا کی ایک ایسی کڑی تھے۔ جن سے شمال میں ایک جدید سلسلہ منسلک ہو گیا۔ اس طرح حاتم۔ مظہر۔ میر اور سودا کی بہت سی غزلیں۔ دکن کے ان قدیم شعرا کی زمینوں ہی میں لکھی گئی تھیں جن کو وہ اپنی معلومات کی کمی کی وجہ سے ولی کی زمینیں سمجھتے تھے۔

ولی دراصل ایک غزل گو شاعر تھا۔ انھوں نے مثنویاں اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان پر ان کی شہرت اور عظمت کا دارومدار نہیں ہے۔ ایک فارسی نثر کا رسالہ نورالمعرفت بھی ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر یہ دراصل ان کے ایک گجراتی ہم عصر شاہ ولی اللہ کی تالیف ہے جن کو غلطی سے شاعر قرار دے کر خود ولی اورنگ آبادی کو ولی گجراتی سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ شاہ ولی اللہ وجیہ الدین گجراتی کی اولاد میں تھے۔ اور ان کی قبر وہیں چینی پیر کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ ولی نے اورنگ آباد ہی میں سنہ ۱۷۰۷ھ میں وفات پائی اور وہیں حضرت سید احمد گجراتی کے تکیہ میں دفن کئے گئے۔

ولی نے فراق گجرات کے موضوع پر جو غزل لکھی ہے اس کے چند شعر یہ ہیں ۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب ہے سینے منے آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں
شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
میرے سینے میں آ کے چمن دیکھ عشق کا
ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں
ہر دم میں بیقرار ہے مثل شرار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا امیدوار دل

ولی ایک آوارہ مزاج ۔ قلندر منش اور بے باک شاعر تھے ۔ ان کے کلام میں مضامین کی رنگینی ۔ خیالات کی وسعت اور طرز ادا کی بے باکی پائی جاتی ہے ۔ ان کا دیوان کئی بار چھپ چکا ہے ۔ اور ان سے متعلق کئی مضامین اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں ۔ ان کی مثنوی سورت کی چند ابیات

یہ ہیں جن سے زبان اور اسلوب بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عجب شہر اس میں ہے پر نور یک شہر
بلا شک وہ ہے جگ میں مقصد دھر
اہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جا دے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور
اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب
دحت کی وہ گویا کھان ہے سب
عجب قلعہ ہے وہاں اک باقرینہ
انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ
فرنگی اس میں اتے ہیں کلہ پوش
عدو وہاں جنکی گنتی میں ہے بیہوش

ولی کے دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر دہلی سے پہلے اور بعد کے کلام میں زبان کا کافی فرق ہو گیا تھا سفر دہلی سے پہلے کا کلام قدیم اساتذۂ دکن کے ہم رنگ ہے اور دہلی سے واپسی کے بعد کلام میں فارسی اضافتیں اور ترکیبیں زیادہ دخیل ہو گئی ہیں۔ دونوں قسم کی غزلوں کے نمونے یہ ہیں۔

مت غصہ کے شعلہ سوں جنتے کو جلاتی جا
تک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ
ناز دیتا نہیں گو رخصتِ گلگشت چمن
اے چمن زار حیا دل کے گلستان میں آ
عیش ہے عیش کر اس مہ کا خیال روشن
شمع روشن کیا مجھ دل کے شبستان میں آ
غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حال ولی
ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

میر[۳۱] جعفر زٹلی ۔ اصل میں شمالی ہند میں نارنول کا رہنے والا تھا لیکن شہزادہ کام بخش کی فوج کے ساتھ دکن آیا۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد دونوں میں قیام کیا اور یہاں کے شعر و سخن کی محفلوں سے متاثر ہو کر خود بھی

دکنی میں شعر گوئی شروع کی۔ چونکہ ہجو سے زیادہ لگاؤ تھا اس لئے بالآخر اسی میں پڑ گیا اور فحش گوئی اختیار کر لی چنانچہ اسی سلسلہ میں ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر بادشاہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

آزلی کا کلیات بہت ضخیم ہے اور اس کی نظمیں مختلف موضوعوں پر ہیں۔ ان میں سلوک، جوبن نامہ۔ اختلاف زباں اور مرثیہ عالمگیر قابل ذکر ہیں۔

آزلی شمالی ہند کے ان شعرا میں سے نہیں تھا جنھوں نے دلی میں ولی کے اثر سے اردو میں شعر گوئی شروع کی تھی۔ بلکہ وہ خود دکن آیا تھا۔ اور اس کے کلام میں ہریانوی اردو اور دکنی تینوں زبانوں کا اثر پایا جاتا ہے۔

جعفر علی کی طرح ایک اور شاعر میر عبدالولی عزلت[۲۲] اس دور میں دکن آیا تھا اور وہ بھی آزلی کی طرح تمام عمر ایک شہر سے دوسرے شہر کو سرگرداں رہا۔ عزلت سورت کا رہنے والا تھا۔ مختلف شہروں اور صوبوں کی سیر و سیاحت کر کے جب اورنگ آباد پہونچا تو ناصر جنگ شہید نے قدر و منزلت کی اور ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ لیکن ناصر جنگ کی وفات کے بعد حیدرآباد کا رخ کیا۔ اور یہاں دو گاؤں بطور جاگیر حاصل کئے۔ آخر کار حیدرآباد ہی میں سنہ ۱۷۷۵ء میں وفات پائی۔

عزلت نہ صرف اردو، فارسی اور ہندی کا صاحب

دیوان شاعر تھا بلکہ ماہر موسیقی اور اعلیٰ درجہ کا مصور بھی تھا۔ میر تقی میر سے بھی ملاقات کی تھی اور عزلت ہی کی بیاض کو پیش نظر رکھ کر میر نے اپنے تذکرۂ نکات الشعرا میں بعض دکنی شعرا کا ذکر کیا ہے۔

شاہ[۲۳] فضل اللہ فضلی اس دور کے ایک مشہور شاعر ہیں جنھوں نے کئی مثنویاں پریم لوکا، برہ بھبوکا اور زادِ راہ وغیرہ لکھیں۔ ان کے والد عطاء اللہ غازی الدین خاں فیروز جنگ کے ساتھ مدفون ہے۔ فضلی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اور ولی کے کم عمر معاصرین میں اپنی طویل مثنویوں کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ سنہ ۱۷۷۰ء میں وفات پائی انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔

عاشق[۲۴]۔ میر یحییٰ عرف عاشق علی خاں برہان پور کے رہنے والے تھے اور شاہ عشق اللہ عاشق کے ہم عصر۔ یہ سپاہی پیشہ تھے اور عاصف جاہ اول کے ساتھ پہلے اورنگ آباد اور پھر حیدر آباد چلے آئے اور پھر یہیں اپنی بقیہ عمر گذار دی اور سنہ ۱۷۵۰ء سے قبل وفات پائی۔ علم و فضل اور انشاپردازی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ شاعری کے دلدادہ تھے اور ولی کے شاگرد یا معتقد۔ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

ولی سن یہ غزل عاشق کے تئیں کہتا اگر ہوتا
رہا کر سگ ہو تو دایم بنی کے آستانے کا

عاشق کا دیوان موجود ہے۔ ان کا کلام نہایت پختہ اور

رنگین ہے۔

مرزا داؤد۔ ولی اورنگ آبادی کا کم عمر ہم عصر تھا جو ان کے بعد بھی عرصہ تک زندہ رہا۔ اور سنہ ۱۷۵۴ء میں وفات پائی۔ اس کے آبا و اجداد بلخ سے عہدِ اورنگ زیب میں اورنگ آباد آئے اور منصب سے سرفراز ہوئے۔ داؤد اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور ولی کی طرح علمی و ادبی فضا سے متاثر ہوئے۔ ولی نے آخری زمانے میں اپنے کلام میں جو پختگی اور زبان میں جو ہمہ گیریت پیدا کی تھی داؤد نے اس کو اور آگے بڑھایا۔ وہ خوش آواز تھے اور جب مشاعرے میں غزل سناتے تو ان کی آواز کی دلکشی پر لوگ جھوم جھوم جاتے۔ وہ پرگو شاعر نہیں تھے۔ لیکن ان کے ہم عصر ان کے کمال سخن کے بڑے مداح اور معترف تھے واقعہ یہ ہے کہ وہ ولی کے ایک سچے جانشین تھے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن
داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں
حق نے بعد از ولی تجھے داؤد
صوبۂ شاعری بحال کیا

ان کی ایک غزل کے تین شعر یہ ہیں:۔

مرا احوال چشم یار سے پوچھ
حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

مرے حال پریشاں کی حقیقت
صنم کے زلف کے ہر تار سے پوچھ
مری ہر اک صدائے آہ کا پیچ
صنم کے چہرۂ بلدار سے پوچھ

غلام قادر سامی[۳۶]۔ اس دور کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر تھے۔ انھوں نے بڑی عمر پائی اور سنہ ۱۸۰۷ء میں فوت ہوئے۔ ان کے دادا اورنگ زیب کے ساتھ دکن آئے اور یہ اورنگ آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ درویش صفت اور با اخلاق صوفی تھے۔ متعدد امراء اور شعراء ان کے معتقد اور شاگرد تھے۔ انھوں نے ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا اور ایک عمدہ مثنوی سحر و شمشاد لکھی تھی۔ جس میں ۵۰۵ علوم و فنون کی معلومات بھی اثنائے قصہ میں درج کردی ہیں۔ ان میں سے بعض کے عنوان یہ ہیں۔

کلام۔ مذہب۔ اخلاقیات۔ جرثقیل۔ طبیعیات طب۔ طلسمات۔ نیرنجات۔ کیمیا۔ سیمیا۔ ریمیا۔ جفر۔ موسیقی معانی۔ منطق۔ عروض۔ برات۔ ہندسہ۔ مساحت۔ نحو قرأت۔ نجوم۔ رمل۔ وغیرہ۔

یہ مسائل تو ضمناً آگئے ہیں لیکن اصل مثنوی سرو اور شمشاد کے معاشقہ کی داستان ہے۔ جس میں سامی نے اپنے عہد کی بڑی عمدہ ترجمانی کی ہے اور اس کے مطالعہ

سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک اورنگ آباد علم و فضل کا کتنا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ یہ مثنوی عینی کی فارسی مثنوی سے ماخوذ ہے۔

اگرچہ سامی کی زبان گولکنڈہ اور بیجاپور کے مثنوی نگاروں کے مقابلے میں صاف ہے۔ تاہم دکنی زبان کا اثر جگہ جگہ نمایاں ہے۔ مثلاً

زمانہ کا میں دیکھا ہوں عجب رنگ
کبھی ہے صلح اس میں اور کبھی جنگ
کوئی عورت نہ کی دعویٰ سنوائی
اسے الفت میں افزوں ہے صفائی
جلانیں کوئی مرد عورت کی خاطر
ستی ہوتی ہے عورت سو ہے ظاہر

سید محمد قادری خاکی۔ ولی کے ہم عصروں میں سے تھے۔ انھوں نے ہاشم علی بیجاپوری کی تقلید میں ریختی کی طرف توجہ کی لیکن اس میں تصوف کی چاشنی نمایاں رکھی اور ایک پورا دیوان مرتب کر ڈالا اورنگ آباد کے مشاہیر اور قدیم شعرا میں سے ان کا دیوان ابھی طبع نہیں ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہے:

پیا بن لے سہیلی آنجھوؤں سے مکھ کو دھوتی ہوں
کبھی میں رات میں گھر اندھارا دیکھ روتی ہوں

رہوں کیوں ابتدا ہی میں وہ سے جب انتہا مجھکو
فنا فی الشیخ ہو کر میں بقا باللہ ہوتی ہوں

محمد ماہ محرم[۳۸] ۔ شجاعت خاں صوبہ دار کے فرزند تھے۔ اور خود بھی معظم خاں خطاب سے سرفراز ہوئے۔ شعر و سخن کے دلدادہ امیر زادے تھے۔ ناصر جنگ شہید نے ان کی قدر افزائی کی۔ ان کی حیات میں اورنگ آباد کے شعرا میں ممتاز رہے۔ بعد کو حیدر آباد چلے آئے تھے اور یہیں سنہ ۱۷۵۲ء میں وفات پائی۔ زبان بہت سلیس اور شگفتہ ہے کچھ نمونے شفیق نے ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے نمونے چھپ چکے ہیں۔

نور محمد عاصی[۳۹] ۔ برہان پور کے ان دلدادگان سخن میں سے تھے جو آصف جاہ اول کی مردم شناسی کے باعث اپنا وطن چھوڑ کر اورنگ آباد چلے آئے تھے۔

عاصی کے والد کا شغر کے رہنے والے تھے اور عہد اورنگزیب میں برہان پور آکر وہاں اقامت اختیار کر لی تھی۔ عاصی یہیں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں نصیر الدولہ صوبہ دار کے ملازم ہوئے شعر و سخن میں محمد علی تسلیم کے شاگرد تھے۔ نصیر الدولہ کی مدح میں ایک ایسا عمدہ قصیدہ لکھا کہ داروغہ قلمدان بنائے گئے۔ جب نصیر الدولہ فوت ہوئے تو آصف جاہ کے یہاں اورنگ آباد چلے آئے۔

انھوں نے چند مثنویاں بھی لکھی تھیں جن میں سے خلاصۃ

المعارف اور انواع العلوم قابل ذکر ہیں۔ غزل گو کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔ چنانچہ ایک وقت آصف جاہ کو ان کی ایک غزل اتنی پسند آئی کہ انعام واکرام سے سرفراز کیا۔ اور خود بھی ان کی غزل پر ایک غزل لکھ کر ان کی عزت بڑھائی۔

آصف جاہ کے انتقال کے بعد ناصر جنگ ان کے قدردان رہے۔ لیکن جب وہ بھی شہید ہو گئے اور اورنگ آباد کی رونق حیدرآباد میں منتقل ہونے لگی تو عاصی حیدرآباد چلے آئے اور یہیں سنہ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

تجھ غم کی آگ دل میں رکھا ہوں چھپا کے میں
ڈرتا ہوں تا فلک نہ اڑے یہ شرر کہیں

تجھ قد کی جب سے نقل کیا ہے چمن میں جا
دیکھا نہ تب سے سرو نے روئے ثمر کہیں

سمجھے ہیں ہم کہ اب کہیں تم نے بھی دل دیا
بیٹھے کہیں ہو بات کہیں ہے نظر کہیں

۱۱۶۴ھ — میر احمد خاں ناصر جنگ نظام الدین شہید آصف جاہ اول کے فرزند اور جانشین تھے۔ اپنے والد سے زیادہ علم وفضل اور شعر وادب کے دلدادہ تھے اور عالموں اور شاعروں کے مربی وسرپرست۔ ان کی تخت نشینی کے وقت اورنگ آباد ہر حیثیت سے عروج

کمال کو پہونچ چکا تھا۔ اور ان کی شہادت کے ساتھ ہی اس شہر کو زوال آگیا اور یہ ایسا اجڑا کہ اب تک پنپ نہ سکا۔

ناصر اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے اور دونوں کے دیوان موجود ہیں۔ وہ اورنگ آباد کے عاشق تھے اور چاہتے تھے کہ یہ شہر علم و فضل اور تہذیب و شائستگی کا مرکز بن جائے۔ چنانچہ دور دور کے صاحب کمال کو جمع کیا اور وہاں ایک ایسی عمدہ فضا پیدا کر دی کہ اہل دکن، بیجاپور اور گولکنڈہ اور حیدرآباد کو بھول گئے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ ایک شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے۔ اور اپنے بھانجے کی بغاوت کو فرد کرنے کے لئے اورنگ آباد سے ایسے نکلے کہ پھر جیتے جی واپس نہ ہوسکے۔ وہ حیدرآباد میں بھی کچھ عرصہ قیام پذیر رہے لیکن یہاں ہر وقت اورنگ آباد کو یاد کرتے رہے۔ یہیں ایک فارسی رباعی بھی لکھی تھی جس میں کہتے ہیں کہ میرا دل اورنگ آباد کا زخم خوردہ ہے اور میری جان اسی پر نثار ہونا چاہتی ہے اورنگ آباد کی تاریک راتیں محبوبوں کی زلفوں سے زیادہ تاریک اور خوشبو دار ہوتی ہیں،، ناصر کی ایک اردو غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

نین تیرے شکار کرتے ہیں — دل ہمارا فگار کرتے ہیں
خوب رو جب سنگار کرتے ہیں — آرسی پر بہار کرتے ہیں
اہل دل گریۂ ندامت میں — سیر ابر بہار کرتے ہیں
چشم بد دور دلبراں سارے — اپنے ناصر کوں پیار کرتے ہیں

ناصر جنگ کرنول میں سنہ ۱۷۵۰ء میں دھوکے سے قتل

کر دیئے گئے۔ اور ان کی لاش اورنگ آباد میں بہ مقام خلد آباد دفن کی گئی۔

ناصر جنگ کے استاد میر غلام علی آزاد بلگرامی اس دور کے ایک ایسے صاحب کمال بزرگ تھے جو بلگرام سے اورنگ آباد آکر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ اور اس کی رونق بڑھانے اور مرکزیت مستحکم کرنے کا باعث بنے۔ ان کے کارناموں نے اس دور کو زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ عربی اور فارسی۔ اردو اور ہندی چاروں زبانوں میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ انھوں نے متعدد تذکرے لکھے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ سبحۃ المرجان (ہندوستان کے علماء کا تذکرہ) یہ اور اس کا ترجمہ مظہر آدم دونوں چھپ چکے ہیں۔

۲۔ ید بیضا (عام شعراء کا تذکرہ)

۳۔ خزانہ عامرہ (صلہ یافتہ شعراء کا تذکرہ)

۴۔ سرو آزاد (ہندی نژاد شعراء کا تذکرہ)

۵۔ ماثر الکرام (علماء بلگرام کا تذکرہ)

۶۔ روضۃ الاولیاء (اولیائے خلد آباد کا تذکرہ)

ان کے علاوہ آزاد نے صحیح امام بخاری کی شرح بھی ابتدا سے کتاب الزکوٰۃ کے آخر تک کی تھی۔ ان کی اکثر کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کے آبا و اجداد بلخ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد عہد عالمگیر میں ہندوستان میں آئے اور غازی الدین فیروز جنگ کے توسط سے شاہی منصب دار مقرر ہوئے۔

عاجز کم عمر تھے کہ ان کے والد نے وفات پائی۔ نواب لشکر خاں نصیر جنگ رکن الدولہ وزیر دکن ان کے عزیز تھے اور انہی کی سرپرستی میں عاجز نے پرورش پائی اور انہی کی سفارش پر نواب آصف جاہ اور نواب ناصر جنگ کے دربار میں باریاب ہوئے اور خطاب منصب اور جاگیر سے سرفراز ہوئے۔

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی اردو مثنوی لال وگوہر بہت مشہور ہوئی۔ اس کی زبان بہت شگفتہ اور سلیس ہے لیکن ان کا اردو دیوان مشکل زمینوں اور مشنویوں سے معمور ہے۔ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنی مشکل پسندی کی وجہ سے شہرت پا چکے تھے۔ انھوں نے شمالی ہند کا بھی سفر کیا اور وہاں دکھنی شاعروں کو مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ اس کا ایک شعر ہے ؎

آکے دکھن میں زباں کا خوب پھیرا ہے پٹا
یا علی عاجز کا تیرے ہند میں جس ہو چکا

آخر زمانہ میں وہ ناندیڑ میں اپنے ایک عزیز کے یہاں مقیم تھے کہ سنہ ۱۷۶۴ء میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے

مثنوی لال وگوہر کا نمونہ یہ ہے۔

کروں میں دشت کی کیوں کر صفت کو — زباں پر کس طرح ڈالوں نعمت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار — اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی — وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی یاد تھی شوریدہ سر سر — وہاں کی کنکری تھی مثل اخگر

بگولا تھا وہاں دن رات قائم
وہاں جھکڑ سدا آندھی تھی دائم

ان کی غزلوں کا رنگ ہی جدا تھا جو ان اشعار سے ظاہر ہوگا۔

عید ہے وصل ترا مجکو طرب کی سوگند
آشنائی سیں تجھے میری طلب کی سوگند

تجھ مکھ کو دیکھ چاند گگن سیں گیا اکڑ
تجھ قد کوں دیکھ سرو چمن سیں گیا اکڑ

چمن میں چل کے سجن بے حجاب ساغر کھینچ
بہار رنگ گلستاں کے سر سیں چادر کھینچ

کر آرسی کی طرح تماشائے خوب و زشت
دل میں کسی سیں عکس نہ رکھ اے صفا سرشت

مقالہ[۳] سراج اورنگ آباد کے آخری بڑے شاعر تھے اور انہیں کی ذات پر دکن کے قدیم استادان فن اور معماران سخن کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے اکثر شاعروں کی طرح کسی سرکاری یا درباری قدردانی کی کوشش نہیں کی بلکہ ولی کی طرح درویشی اور قلندری میں اپنی عمر گزار دی۔ مرزا داؤد کے بعد ہی ولی کے سچے جانشین اور معتقد تھے انھوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

تجھ مثل اے سراج بعد ولی   کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

سراج ایک مذہبی خاندان میں سنہ ۱۷۱۱ء میں پیدا ہوئے

تھے۔ ان کے والد سید درویش ابن سید گوہر مدینہ کے ایک بزرگ سید محمد کی اولاد میں تھے جو ہندوستان آکر دہلی کے نواح میں قیام پذیر ہوئے تھے اور بعد کو ان کی اولاد دکن میں آ بسی سراج کی پیدائش کے وقت اورنگ آباد اردو شعر و سخن کا مرکز بن چکا تھا اور انھوں نے اسی فضا میں آنکھیں کھولیں۔ ان کی شاعری ان کے عنفوان شباب کی پیداوار ہے اور ان کا دیوان سنہ ۱۷۳۵ء تک مرتب ہو چکا تھا اور وہ ایک استاد کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ انھوں نے سات مثنویاں بھی لکھی تھیں جن میں بوستان خیال اردو کے ادب عالیہ میں شمار کی جاتی ہے ان کا کلام تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ لیکن غزل اور مثنوی میں ان کو لازوال شہرت حاصل ہوئی اور ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں دور دور تک پہونچ گیا۔ آخر زمانے میں انھوں نے شاعری ترک کر دی تھی۔ اور فقر و تصوف میں مشغول ہو گئے تھے انھوں نے سنہ ۱۷۶۳ء میں وفات پائی۔ اورنگ آباد ہی میں مدفون ہوئے۔

سراج کی یہ غزل تمام ہندوستان میں مشہور رہے:۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی
شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمت غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا

مگر ایک شاخ نہاں غم جسے دل کہو وہ ہری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں سو بھری رہی
ترے جوش حیرت حسن کا اثر اسقدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں رہی جلا نہ پری کوں جلوہ گری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ ضرر رہا مگر ایک بے خطری رہی

یہ دور سراج ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ سراج کے بعد دکنی شعرا کی خود اعتمادی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور وہ شمالی ہند کے شعرا کی شاگردی ہی پر اپنی زبان اور بیان کی صحت و خوبی کا انحصار کرنے لگے تھے۔ کیوں کہ اس وقت وہ دکنی محاورہ اور روزمرہ چھوڑ کر شمالی ہند کی زبان کی پیروی کرنے لگے تھے۔

دکھنی ادب کا اثر

شمالی ہند کی اردو پر

اورنگ زیب کے دکن کو فتح کرنے کے بعد جب شمال اور دکن میں ملاپ ہو گیا اور دکن کے لوگ شمال اور شمال کے دکن آنے جانے لگے تو دونوں کو اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا لیکن چونکہ دکن والوں نے اس میں خاصہ ادبی کام کیا تھا شمال والوں نے معلوم کیا کہ ہم اس بارے میں دکن سے بہت پیچھے ہیں۔ وہاں کسی شخص نے بھی بول چال کی زبان میں شعر و شاعری کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اور جو ایک دو مثالیں ملتی ہیں انہیں اس زمانے کے قدیم تذکرہ نویس سنجیدہ اور صحیح شاعری کا نمونہ نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ تفنن کے طور پر لکھے گئے تھے۔ اس عہد کے اور اس کے بعد کے دو چار شاعر ایسے ملتے ہیں جنھوں نے کچھ اردو میں لکھا تھا۔ مثلاً

مرزا معز موسوی خاں فطرتؔ اورنگ زیب کے زمانے

کے ایک فارسی گو شاعر تھے۔ ان کا یہ اردو شعر تذکروں میں ملتا ہے۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے
در خانہ آئینہ گتا جوم پڑی ہے

مرزا معزؔ کے ساتھ ایک اور شاعر قزلباش خاں امیدؔ کے بھی اردو شعر ملتے ہیں۔ جس کا نمونہ یہ ہے۔

بامن کی بیتی آج مری آنکھ موں پڑی
غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی

اس قسم کے شعروں کے علاوہ اورنگ زیب کے زمانے کے چند اردو شعر بھی ملتے ہیں۔ جو جعفر علی (زٹلی) کی تصنیف ہیں۔ یہ زیادہ تر فحش ہیں تاہم کتب خانہ انڈیا آفس (لندن) اور ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطوں میں بعض ایسے بھی پائے گئے ہیں جنہیں کوئی سنجیدہ کہہ سکتا ہے۔ ان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ تاکہ دکن کے اثر سے پہلے کی اردو شاعری کی نوعیت معلوم ہوسکے۔ اورنگ زیب کی مدح میں لکھا ہے۔

زہے دھاک اورنگ شاہ ولی
در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی

دریں پیر سال وضعیف بدن
مچائی دھما چوکڑی در دکھن

زہے شاہ شاہاں کہ گاہ دغائے
نہ ہلد نہ ٹلد نہ جنبید جائے

برآورد لشکر بسا دھوم دھام
کہ ہل چل پڑی بر سر روم و شام

تھا سورج جو دھا بل بے بدل
چو البرز قائم چو پربت اٹل

اورنگ زیب کی وفات کا مرثیہ،۔

اکل بے کل ہوا سنسار سارا
بخوں نیار شد مریخ تارا

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ
مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

صدائے توپ و بندوقہا است ہرسو
چھٹا چھٹ و پھٹا پٹ است ہرسو

بہرسو مار مار و دھاڑ دھاڑ است
اچھل چال و تیر و خنجر گداز است

غرض اس قسم کی اردو شاعری کرنے والوں نے جب دیکھا کہ دکن میں مدت سے اردو شاعری کا ذوق ترقی کر چکا ہے تو وہ دکھنی ادب سے متاثر ہو گئے اور چونکہ اس اثنا میں وہ فارسی شاعری کی تقلید سے اکتا گئے تھے. ایک غیر ملک کی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے انھیں خاصی محنتیں کرنی پڑتی تھیں. اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلے میں خود کو کم زور پاتے تھے۔ ساتھ ہی چونکہ فارسی ان کی اپنی مادری زبان نہ رہی تھی. وہ اپنی طرف سے ادائے خیال کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے سے قاصر تھے. انھیں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں ایرانی استاد ان کی زبان کو غلط نہ قرار دیں. چنانچہ

اس زمانے میں محاوروں وغیرہ کے استعمال پر اکثر ایرانی اور ہندوستانی شاعروں میں جھگڑے رہتے تھے جن کی مثالیں قدیم تذکروں میں کثرت سے موجود ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ خود حکمراں شاعر نہیں تھے اور نہ سیاسی کمزوریوں کی وجہ سے شاعروں کی قدر کرنے کے قابل تھے۔ اگر اکبر کے چند درباری امیروں کی طرح اورنگ زیب اور اس کے بعد کے فارسی شاعروں کی خاطر خواہ قدر کرتے تو بہت ممکن تھا کہ فارسی پھر کچھ زمانے کے لئے چل نکلتی

اس کے علاوہ چونکہ فارسی میں ہندوستانی شاعروں کے لئے خیالات ادا کرنے کے نئے طریقے مسدود تھے اور اس کے علاوہ اس میں اپنی مقامی خصوصیات اور فطری حالات کو بے دھڑک ظاہر کرنا معیوب سمجھتے تھے اس لئے وہ فطرتاً کسی ایسی چیز کے متلاشی تھے جس کے ذریعہ سے وہ بے تکلفی کے ساتھ اپنے مطالب ادا کر سکیں۔

غرض جب انھوں نے دکھنی اردو کا مطالعہ کیا جو ان کے لئے فارسی سے زیادہ قریب تھی اور جس کے ذریعہ سے ان کی تمام ادبی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں تو فارسی کو چھوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس سے اس قدر بیزار ہو گئے اور اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا کہ جب سودا یا

میر جیسا کوئی بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے رتبے سے اتر کر یہ کام کر رہا ہے۔

شمالی ہند میں ریختہ گوئی کی ابتدا اور فارسی ترک کرنے کا سبب میر نے شاعرانہ طریقے سے بڑا پُر لطف پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس زمانے میں جو دکھنی شاعر شمال گئے ان کی تعداد میں جیسے جیسے اردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جاتے ہیں اضافہ ہو رہا ہے۔ مصحفی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ دکھنی شاعر دہلی گئے تھے۔ جہاں انھوں نے خاص قدر و منزلت حاصل کی۔ تذکرۂ اعظم الدولہ سرور سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے۔

مصحفی کے تذکرے میں تیس کے قریب شمالی ہند کے ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں۔ جو دکن گئے تھے۔ اگر اس زمانے کے اور تذکروں کا اس لحاظ سے تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو یقین ہے کہ اس تعداد میں اور بھی اضافہ ہو سکے گا۔ تاہم یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شمالی ہند میں شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں سے جتنے بھی اس وقت تک نظر سے گزرے ہیں ان میں ڈیڑھ سو کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو کسی

نہ کسی طرح دکھن سے تعلق رکھتے ہیں

یہ تو شاعری کا ذکر تھا اس زمانے میں دکھن کے بہت سے ایسے لوگ بھی شمال گئے جو شاعر نہیں بلکہ اہل ذوق تھے یہ لوگ دکھنی اردو کی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ شمال لے گئے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں شاہان اودھ کی کتب خانوں میں دکھنی کی اچھی خاصی کتابیں جمع ہوگئیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس قدر جلد دکھنی ادب شمال میں مقبول ہوگیا تھا کہ اس کے بعض اجزا شاہی کتب خانوں تک بھی پہنچ سکے اس کا ثبوت اس طرح بھی ملتا ہے کہ ہندوستان اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکھنی مخطوطے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنھوں نے وہیں محمد شاہ کے ابتدائی دور میں ان دکھنی کتابوں کو نقل کیا تھا۔

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکھنیوں کے اشعار عام طور پر قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ لوگ دکھنی شاعروں کی آؤ بھگت کرتے تھے ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا۔ ایک شعر ان سے منسوب ہے ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دہلی کے شاعر ولی کی غزلوں پر غزلیں لکھنا باعث کمال

سمجھتے تھے۔ اور انہیں کے مشورے سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ اب شمال کے اس زمانے کے شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے تاہم دیوان زادۂ حاتم سے (جو اس زمانے کی تنہا یادگار ہے۔ اور جس کا ایک نفیس بلکہ اصلی نسخہ اس وقت انڈیا آفس میں محفوظ ہے) اس کی شہادت ملتی ہے۔ خود دیباچہ میں حاتم نے ولی کی استادی کا ذکر کر دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ میں انھیں کی طرز پر لکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اشعار میں متعدد جگہ ولی کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں ان کے موجودہ مختصر سے انتخاب میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن پر صراحت سے لکھا گیا ہے کہ ولی کی طرز اور تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ بعض شعروں میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولی کی موجودگی ہی میں لکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں مزید معلومات میرے اس مضمون میں درج ہیں۔ جو شاہ ظہور الدین حاتم کے عنوان سے رسالہ ہندوستانی الہ آباد میں شائع ہوا ہے۔

تذکرۂ قاسم (مخطوطہ انڈیا آفس) میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانے کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ پیر خاں نے بہت ہی بجا اور برموقع کہا ہے کہ

ع "ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"

معلوم ہوتا ہے کہ اول اول شمال کے فارسی شاعروں نے ولی کی مخالفت بھی کی تھی۔ چنانچہ ناصر علی کے متعلق لکھتے ہیں۔

اچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

اسی زمانے کے ایک اور تذکرے میں (یعنی تذکرہ بے جگر جس کا مخطوطہ جو غالباً مصنف ہی کا مسودہ ہے انڈیا آفس لندن میں موجود ہے) ولی کی نسبت لکھا ہے۔

درحقیقت جس نے ہندی کے میدان میں گھوڑے دوڑائے وہی تھا اور فی الواقع جس شخص نے کہ آب رفتہ دوبارہ زبانِ ہندی میں پہونچایا وہی تھا جب ۱۲ سنہ جلوس محمد شاہی میں اس کا دیوان دہلی پہونچا۔ اس زمانے کے اعلیٰ پایہ کے شعرا، مثلاً حاتم۔ آبرو۔ فغاں وغیرہ اس کی زبان کا متبع اور پیروی کرنے اور اسی کی زبان کا اسلوب اختیار کرنے لگے" (ترجمہ فارسی سے)

ایک اور تذکرہ "طبقات سخن" میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے کہ:۔

"جب دیوان ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی کا محمد شاہ کے عہد میں دہلی پہونچا تو اس کی پیروی کی" (ترجمہ)

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں خود حاتم کا قول ان کے ذکر میں نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا کلام دہلی میں بیحد مقبول ہوگیا تھا وہ کہتے ہیں۔

"ایک روز میں فقیر بیان کیا کہ سنہ ۱۲ فردوس آرام گاہ

میں دیوان شاہ جہاں آباد میں آیا اور اس کے
اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہوگئے اور
دو تین آدمیوں کے ساتھ جن سے مراد تاجی مضمون
ممنون اور آبرو ہیں ہندی اشعار کی بنیاد ایہام
گوئی پر رکھی اور معنی یابی اور مضامین کی تلاش
کی داد دی۔" (ترجمہ)

ولی کے علاوہ جن دکھنیوں نے دلی میں شہرت حاصل کی ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی دکھنی بھی شامل ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرہ کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ:۔

"سمجھنا چاہئے کہ ریختہ پہلے زبان دکھنی تھا" (ترجمہ)

فقیر اللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں:۔

"فراقی دکھنی کے ہمراہ شاہ جہاں آباد میں آیا تھا۔ دردمند طبیعت رکھتا تھا اور بہت صاف کلام تھا۔ خدا اس کو بخشے۔" (ترجمہ)

غرض اہل شمال نے بہت جلد فارسی شاعری کو ترک کر دیا اور دکن کی تقلید شروع کر دی۔ وہاں کے شاعروں کو استاد مانا اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ دکھنی زبان اور محاورے میں شاعری کریں اور نہ صرف یہی بلکہ جو شخص دکھنی طرز کے خلاف لکھتا اس کو برا بھلا کہا جاتا اور اس کی شاعری غلط سمجھی جاتی۔ چنانچہ

اس زمانے کے ایک مشہور دہلوی شاعر شاہ مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے دیوان زاد کے دیباچہ میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ۔

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے
ان سستی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اس کے ریختہ میں حرف ہے

دکھنی اثر کے بعد شمال میں جن ہندو اور مسلمان شاعروں نے فارسی شاعری ترک کر کے دکھنی طرز میں شاعری شروع کردی ان کی تعداد خاصی ہے اور تذکروں میں ان کے متعلق کافی مواد موجود ہے۔

لیکن دہلی کے شاعروں کا یہ رجحان زیادہ دیرپا نہیں قائم رہ سکا۔ دکھنی بھی فارسی کی طرح ان کی اپنی زبان نہ تھی۔ اس میں بھی خیال ادا کرنے کے لئے انہیں تکلف کرنا پڑتا تھا۔ اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی مادری اور بول چال کی زبان میں فارسی اجزا ملا کر شاعری کریں۔ اگرچہ پہلے پہلے بعضوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن وہ اس تبدیلی میں کامیاب ہوگئے اور بہت جلد اردوئے معلی کی زبان میں شعر و شاعری شروع ہوگئی اس کا آغاز حضرت مرزا جان جاناں مظہر نے کیا اور اس کی ترقی ناسخ کے زمانے تک جاری رہی۔ اس تبدیلی کا ذکر حاتم نے جن کو شمال میں دکھنی کے عروج اور زوال دونوں کا دیکھنا

نصیب ہوا تھا۔ اپنے دیوان کے دیباچہ میں وضاحت سے کر دیا ہے۔

"اس زمانے میں بہ تربیت طلب دس بارہ سال سے اکثر الفاظ کو نظر سے گزارا کر عربی و فارسی الفاظ کو جو قریب الفہم اور کثیر الاستعمال ہوں اور روزمرہ دہلی کو کہ میرزایان ہند و فصیح گویان محاورہ میں رکھتے ہیں منظور سمجھا۔ اس کے علاوہ ملک کی زبان اور ہندی کہ اس کو بھاکا کہتے ہیں۔ موقوف کر کے فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند تھا۔ اختیار کیا۔" (ترجمہ)

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ اس انتخاب میں قدیم (دکھنی) طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کئے ہیں۔ اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجئے۔

اس لسانی تبدیلی کو بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ تذکرہ مخزن نکات میں خود قائم نے اس تبدیلی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ پہلے ان شاعروں کے نقائص اس طرح ظاہر کرتے ہیں جنھوں نے دکھنی کی تقلید کا آغاز کیا تھا۔

"راہ سخن کے جاننے والوں سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد سے بہادر شاہ اول کے زمانے تک جن لوگوں نے ریختہ میں شاعری کی ہے ان کا طریقہ کلام بہت ہی مربوط اور معقول ہے اگرچہ اکثر الفاظ جو ہمارے لئے غیر مانوس ہیں

ان کے یہاں مستعمل ہیں۔ لیکن چونکہ زبان وکن کے موافق صحیح اور درست ہیں۔ اس لئے ہر ایک کے لئے لائق استعمال تھے۔ نہ یہ ستم کہ محمد شاہ کے زمانے کے شعرا نے اپنے نئے الفاظ اور ایہام تلاش کرکے شعر کو مرتبۂ بلاغت سے گرا دیا۔ معنی تو کیا پوچھنا کچھ کہا نہیں جا سکتا اس لئے کہ بزرگوں کی خطا بتانا خطا ہے۔" (ترجمہ)

طبقۂ دوم کے شاعروں مثلاً حاتم و ناجی و مظہر کے ذکر کے بعد طبقۂ سوم یعنی میر۔ سودا اور سوز وغیرہ کا ذکر شروع کرنے سے پہلے ان کے فارسی کی طرف توجہ کرنے کی نسبت حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

"مخفی نہ رہنا چاہئے کہ اب جن شعرائے متاخرین کے اشعار و حالات لکھے جاتے ہیں ان کا طرز کلام شعر فارسی کے رد یہ پر ہے۔ چنانچہ جملہ شعری صنعتیں جو قدیم اساتذہ استعمال کرتے تھے۔ یہ بھی کرتے ہیں اور اکثر ایسی فارسی ترکیبوں کو جو اردوئے معلی کے محاورے کے موافق ہیں۔ اور کانوں سے مانوس ہیں۔ جائز سمجھتے ہیں۔ مگر زبان مغل کا ترجمہ ریختہ میں کرنا بری بات ہے۔ اس لئے کہ اس طرح دونوں میں سے کسی الگ زبان کی صحت بھی باقی نہیں رہتی۔ اگر بعض اصطلاحیں جو اس ملک کے فصیحوں کی زبان زد

ہیں استعمال کریں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن طبقۂ اول
کے شعرا کی تقلید کہ ان کا ایک مصرعہ ریختہ اور دوسرا
فارسی ہوتا تھا اور بعض ریختہ اور فارسی کو غیر مانوس
الفاظ سے ملا دیتے ہیں قابل مذمت ہے۔"

مظہر نے جو دکھنی اثر کو دور کر کے فارسی آمیز زبان میں شاعری شروع کی۔ اس کے بہت سے ثبوت تذکروں میں ملتے ہیں جن کا تفصیلی بیان مظہر کی شاعری کے ذکر میں کسی اور موقع پر کیا گیا ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار غالباً ضروری ہے کہ دکھنی کے رواج کی طرح دکھنی کا ردعمل بھی بڑی تیزی سے شروع ہو گیا۔

شمال والوں کو دکھنی اثر کے زائل کرنے میں جلد کامیابی اس لئے بھی حاصل ہو گئی کہ اس کو زائل کر کے شمال کے روزمرہ میں شاعری کرنے کی کوشش میں حصہ لینے والے میر، سودا اور قائم جیسے بڑے بڑے شاعر بھی تھے۔ چنانچہ ان تینوں کے بعض وہ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں جن میں اس امر کی طرف اشارے ہیں۔

سودا

کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی
سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے

زبان میر پہ روشن ہے سارے عالم پر
جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا :
پسند خاطرِ دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال
یہ سنگ ریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

میر

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں اس عیب کو ہنر سے

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

قائم

قائم میں ریختہ کو دیا خلعتِ قبول
ورنہ یہ پیش اہلِ سخن کیا کمال تھا

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات پچر سی یہ زبان دکنی تھی

اشاریہ

مرتبہ

خواجہ حمید الدین شاہد

(الف)

آبرو۔ شاہ مبارک ۱۳۱، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲

آتشی حکیم ۳۷، ۱۲۰

آزاد بلگرامی میر غلام علی ۱۴۵، ۱۴۶

آزاد فقیر اللہ ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۶۱

ابراہیم قلی قطب شاہ ۱۹، ۶۳، ۶۵، ۶۶، ۶۷

آصف جاہ اول ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۷

آگرہ ۱۳۰

آندھرا ۶۲، ۶۴، ۷۱

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۱، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲

۳۳، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۹، ۷۹

احمد نگر ۱۰، ۳۱، ۴۳

احوال مصیبت اہل بیت ۷۲

ابراہیم نامہ ۳۶،
ابن حسام ۴۶،
ابن نشاطی ۲۰، ۶۶، ۷۲
۷۶، ۸۰، ۸۱، ۸۲
۹۱، ۹۲، ۹۳، ۱۱۶
ابوالحسن شاہ ۳۹،
احکام الصلوٰۃ ۵۵،
احمد ۶۷، ۷۲
احمد آباد ۱۲۹
احمد خاں سید ۱۱۴،
احمد سید گجراتی ۱۳۳،
احمد خاں ۱۵،
احمد شیخ ۸۱،
احمد شاہ ثالث ۱۴، ۱۵
احمد شاہ ولی بہمنی ۱۴
امیر خسرو ۴۸
امین ۴۱، ۹۳، ۱۲۲
امین خاں ۶۵
امین الدین اعلیٰ ۵۵، ۵۹، ۶۰
امین شہزادہ محمد ۶۴،
انڈیا آفس ۱۵۳، ۱۵۹
اختلاف زباں ۱۳۶،
ادارہ ادبیات اردو ۸۴، ۱۵۳
اڈیکیٹ ۱۱۲،
ارشاد نامہ ۳۴،
اسرار عشق ۵۹،
اسمٰعیل خطاط خاں ۴۵
اسمٰعیل عادل شاہ ۲۹
اشارات الغافلین ۱۲۳،
اشرف ۲۱، ۲۲
اشرف سید ۱۲۳، ۱۲۵
افضل ۹۳، ۹۴
افضل خاں شیرازی ۳۰،
اکبر جلال الدین ۱۱، ۳۳، ۱۵۵
امامی ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۰
امید قزلباش خاں ۱۵۳
۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰
۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۲
۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴
۱۵۵
ایاغی امین محمد ۵۸،
ایڈنبرا یونیورسٹی ۱۰۷، ۱۲۸، ۱۶۰

انواع العلوم ۱۴۳
اورنگ آباد ۱۰، ۱۲۵، ۱۲۹
۱۳۳، ۱۳۶، ۱۳۷
۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۱
۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴
۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۸
۱۴۹، ۱۵۰
اورنگ زیب ۸۷، ۹۳، ۹۸
۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۹، ۱۱۰
۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۸
ایران ۶۴

(ب)

بہار ۱۱۲، ۱۴۲
برہان الدین شاہ خلیل اللہ ۱۲
برہان الدین جانم ۳۴، ۵۵
برہان الدین اولیا ۸۶
برہان پور ۸۰، ۱۰۶، ۱۳۸
۱۴۲
برہ بھوکا ۱۲۷
بشارت الذکر ۳۶
بصرہ ۱۱۴
بلاقی سید ۸۲، ۸۳
باجن بہاؤالدین ۲۷
بانارحسن ۴۸
باغ حسینی ۱۱۲
باغ جانفزا ۱۲۱
بحری قاضی محمود ۱۰۰، ۱۰۱
۱۱۲، ۱۳۰
بحیرۂ بنگال ۱۰
بحیرۂ عرب ۱۰
بخاری امام ۱۴۶
بودھن ۱۰
بوستان خیال ۱۴۹
بہادر شاہ اول ۱۴۴
بھاگ متی ۷۰
بھاگیہ رتی ۶۴
بہرام و بانو حسن ۱۴
بہرام و گل اندام ۹۰
بہمنی دور ۲۷، ۳۱، ۶۲
بہمنی سلطنت ۹، ۲۷
بیجاپور ۱۰، ۱۱، ۲۶، ۲۷

بیل ۱۲۰،
بلخ ۱۳۸،
بلگرام ۱۴۵، ۱۴۶
بنارس ۳۳
بندہ نواز خواجہ ۱۲، ۱۳، ۲۳
۲۵، ۲۶، ۳۳
۵۱، ۸۴
۱۲۰، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۹
۱۴۱، ۱۴۴
بیچارہ ۱۱۸،
بیدار ۱۰، ۱۴، ۵۵

(پ)

پدم راؤ ۱۴، ۱۵،
پدماوت ۹۷، ۱۱۵،
پریم لوکا ۱۳۷،
پنچھی باچھا ۱۲۱،
پند دلپسند ۵۸
پندنامہ ۵۸،
پندنامہ لقمان ۱۲۲،
پوتی کنتی نیلی گنا ۶۵،
پھول بن ۷۲، ۷۶، ۸۰،
۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱،
۳۲، ۳۴، ۳۷، ۳۸،
۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۳،
۴۵، ۴۷، ۴۸، ۵۱،
۵۲، ۵۵، ۵۸، ۶۰
۷۶، ۷۹، ۱۰۰، ۱۰۱،
۱۰۶، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴،

(ت)

تاج الحقائق ۵۰
تاریخ اسکندری ۵۲،
تاریخ قطب شاہی ۸۸،
تاناشاہ ابوالحسن ۸۷، ۸۸،
۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۳،
۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸،
۹۹، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۵،
۱۰۶،
تحفۂ عاشقاں ۱۲۱،
تحفۃ النصائح ۳۹، ۸۲،
تذکرہ اعظم الدولہ سرور ۱۵۷،
تذکرہ بے جگر ۱۶۰،
تذکرہ قاسم ۱۵۹،

۸۱، ۹۷، ۱۱۵،
پیر خاں ۱۵۹

تسلیم محمد علی ۱۴۲
تقی خاں سید محمد ۱۱۴
تلنگانہ ۹، ۷۱،
تمیم انصاری ۴۴،
توصیف نامہ میر محی الدین ۲۰،

(ٹ)

ٹاٹ شاہ ۱۱۱،

(ج)

جامعہ عثمانیہ ۱۱۲،
جانسی ملک محمد ۹۷، ۱۱۵،
جعفر زٹلی میر ۱۳۶، ۳۷، ۱۵۳،
جلال پیر محمد ۹۷، ۱۱۵،
جمشید قلی ۶۳، ۶۴،
جمنا ۱۱۲،
جنگ نامہ حیدر ۱۲۴،
جنگ نامہ محمد حنیف ۹۳،
جنیدی ۷۹، ۸۰،
حدیقۃ السلاطین ۸۸،
تذکرۃ الملوک ۳۲،
تذکرہ میر حسن ۹۹،
ترین عبدالحمد ۱۲۱،
جوبن نامہ ۱۳۶،

(چ)

چت لگن ۱۱۵،
چٹ پٹیہ ۱۲۶،
چکی نامہ ۸۵،
چندا اور لورک ۷۳،
چندر بدن و ماہیار ۴۰، ۴۲، ۱۲۰،
چینا پٹن ۵۹،
چینی پیر ۱۳۲،

(ح)

حاتم شاہ ظہور الدین ۱۳۱، ۱۳۲،
۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲،
۱۶۳، ۱۶۵،
حاتم طائی ۱۱۸،
حافظ شیرازی ۱۱، ۶۸،
حبیب اللہ ۱۶،
حدائق السلاطین ۸۹،
۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۴،

حراست خاں ۱۲۶،
حسین حضرت امام ۲۲، ۱۰۲،
۱۰۵، ۱۱۲، ۱۲۴، ۱۲۷،
حسین شاہ ۱۱۱،
حسین قلی ۶۴،
حسین واعظ کاشفی ۱۲۷،
حسینی ۵۸، ۵۹،
حفیظ سید ڈاکٹر ۳۵،
حیدرآباد ۷۶، ۷۷، ۷۸،
۷۹، ۸۲، ۸۵، ۸۷،
۹۳، ۹۵، ۹۶، ۹۷،
۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱،
۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶،
۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴،
۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۳،
۱۲۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸،
خوش نغز ۲۴،
خوشنود ملک ۴۷، ۴۸،
۴۹، ۷۹،
خوشنودی ۲۳،
خیالی ملا ۶۵، ۶۶، ۸۲،

(خ)

خانقاہ عنایت الٰہی ۱۲۳،
خاور نامہ ۳۸، ۴۶،
خاکی سید محمد قادری ۱۴۱،
خدا بندہ ۶۴،
خدیجہ سلطان ۳۸، ۴۵، ۴۶،
۴۷، ۷۹،
خزانہ عامرہ ۱۴۶،
خسرو نامہ ۱۲۱،
خلاصۃ المعارف ۱۴۳،
خلد آباد ۱۴۵، ۱۴۶،
خلیل اللہ ۱۶،
خلیل اللہ بت شکن ۱۶، ۱۷،
خواجوئے کرمانی ۱۷، ۱۸
خواص ۹۳،
خوش نامہ ۲۳
۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۷،
۱۶۲، ۱۶۴،

(د)

دہلی ۱۲، ۵۳، ۱۰۹، ۱۱۲
۱۱۸، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۷،

۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۴
داؤد مرزا ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۹،
دردخواجہ میر ۱۳۱،
درویش سید ۱۴۹،
دریا ۱۲۱
دعائے فاطمہ ۱۲۷،
دکن ۵۳، ۶۱، ۶۲، ۷۱،
۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۵، ۱۰۶،
۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۴،
۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۳۰،
۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۶،
۱۳۷، ۱۴۹، ۱۵۲، ۱۵۳،
دولت آباد ۱۲،
دولت مرزا ۴۱، ۴۲،
دھارور ۱۲۱،
دہ مجلس ۱۲۷،
دیپک پتنگ ۱۱۵،
دیوان حسینی ۱۰۶،
دیوان زادہ حاتم ۱۵۹،
دیوان غزلیات ۱۱۵،
دیوان ولی ۱۶۱، ۱۶۲،

(ذ)

ذوقی سید شاہ حسین ۱۱۹، ۱۲۰،

(ر)

راجو حسینی ۳۹،
راجو شاہ ۱۲، ۸۲، ۸۳
۸۴، ۸۷، ۸۸، ۹۱،
۹۲، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۳
۱۲۸،
راجی عبدالعلی ۱۲۰،
۱۳۵، ۱۴۹، ۱۵۸، ۱۶۰،
۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳،
روحی ۹۹، ۱۰۳، ۱۰۴،
۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۹،
روضۃ الانوار ۱۲۷،
روضۃ الاولیا ۱۴۷،
روضۃ الشہدا ۵۸، ۱۲۷،
روضۃ العقبیٰ ۱۲۷،

(ز)

زادراہ ۱۳۷،
زٹلی ۱۳۶، ۱۳۷

رازی قطب ۳۹،
رتن پدم ۱۲۷،
رحمٰن ۱۲۶، ۱۳۰،
رستمی کمال خاں ۴۵، ۴۶،
رضوان شاہ وروح افزا ۹۸،
رفیع الدین شیرازی ۳۲،
رکن الدین سمنانی ۱۸،
رموز الواصلین ۳۶،
سدھوٹ ۱۲۶،
سراج شاہ ۱۴۸، ۱۴۹
۱۵۰،
سرو آزاد ۱۴۶،
سرود شنشاد ۱۴۰،
سکندر عادل شاہ ۵۲، ۱۰۰،
سکھ سہیلا ۳۵،
سلسلہ یوسفیہ ۶۷، ۷۰،
۷۸،
سلطان قلی ۶۳،
سلطان ۸۲، ۱۳۲،
سنوک ۱۳۶،
سودا ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۵۶،
زلیخائے ثانی ۱۲۲،
(س)
سات گڑھ ۱۲۶،
سامی غلام قادر ۱۴۰، ۱۴۱،
سانگڑے سلطان بید علی ۱۲۲،
سبحۃ المرجان ۱۴۶،
سبحان قلی ۱۶۳،
سب رس ۷۰، ۷۱، ۷۷،
سید حسین ۱۱۴،
سید علی ۱۱۸،
سید محمد ۱۴۹،
سید محمد جونپوری ۵۹،
سیف الملوک و بدیع الجمال ۷۴،
سیوا ۵۸،
سیوک ۹۳،
(ش)
شاہان اودھ ۱۵۷
شاہ پور ۲۳،
شاہ پیٹ ۲۶،
شاہ جہان آباد ۱۶۱،
شاہ عالم ۱۴۱،

۱۶۵، ۶۶،
سورت ۱۳۴، ۱۳۷،
سوز ۱۶۵،
سہ نثر ظہوری ۱۳۲،
شاہ ملک ۵۵،
شاہ من عرف ۶۰،
شاہ نامہ ۴۶
شجاعت خاں ۱۴۲
شجرۃ الاتقیا ۶۰،
شرح تمہیدات عین القضات ۸۴،
شرح مرغوب القلوب ۲۵،
۸۴،
شریعت نامہ ۵۵،
شغلی ۵۸،
شفیق لچھمی نرائن ۱۴۲،
شوقی حسن ۴۳، ۴۴، ۷۶،
۸۲،
شمائل الاتقیا ۸۶،
شمائل النبی ۱۲۱،
شمالی ہند ۱۱۲، ۱۳۴، ۱۳۱،
۱۳۶، ۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۱،
شاہ عالم بہادر شاہ ۱۱۲،
شاہ علی جیو گام دھنی ۲۷،
شاہی ۴۹، ۵۰،
شاہی شاہ قلی خاں ۹۸
۱۵۲، ۱۵۶، ۱۵۷،
۱۵۸،
شہادت الحقیقت ۲۴،
شہباز حسینی ۱۲، ۲۵، ۲۶،
۲۷، ۳۱،
شہید قمی ۲۹،
شیراز ۳۷،

(ص)

صالح شیخ محمد ۱۳۰،
صبغۃ اللہ شاہ ۴۲
صنعتی محمد ابراہیم ۴۴

(ض)

ضعیفی شیخ داؤد ۱۰۸، ۱۰۹،
۱۱۰، ۱۱۱

(ط)

طالب دموہنی ۱۱۹،
طبعی ۸۳، ۹۰، ۹۱، ۹۱، ۹۳، ۹۳،

طبقات سخن ۱۶۰،
طوطی نامہ ۷۵، ۷۶، ۷۷

(ظ)

ظفرنامہ محمد حنیف ۹۶،
ظل اللہ ۷۳،
ظہور ۴۲
ظہوری نورالدین ۳۲، ۴۲

(ع)

عابد شاہ ۸۳، ۸۴
عاجز عارف الدین خاں ۱۴۶،
۱۴۷،
عاشق شاہ عبداللہ ۱۲۲،
عاشق میر یحییٰ
عاشق علی خاں } ۱۳۸
عاشق عشق اللہ ۱۳۸
عاصی نور محمد ۱۴۲، ۱۴۳،
عالمگیر ۱۴۶،
۱۱۶، ۱۱۸،
عطار شیخ فریدالدین ۱۲۱،
عطاء اللہ ۱۳۷
علاؤالدین ہمایوں شاہ ۱۵،
عدل ۳۶، ۳۷،
عبدالحق مولوی ۵۱،
عبدالقادر جیلانی ۷۰،
عبدالحکیم ملا ۸۸،
عبدالقادر خاں ۶۴،
عبدالقادر ۱۰۷
عبدالرحمٰن قادری ۱۱۲، ۱۱۳،
عبداللہ حسینی ۱۳
عبداللہ شاہ ۱۲۷،
عبداللہ قطب شاہ سلطان ۴۸،
۷۰، ۷۵، ۷۶، ۷۷،
۷۸، ۷۹، ۸۲، ۸۳،
۸۴، ۸۷، ۸۸، ۹۳،
۹۴، ۹۵، ۹۷، ۱۳۲،
عروس عرفان ۱۰۱،
عزلت میر عبدالولی ۱۳۷،
عشرتی سید محمد خاں ۱۱۴، ۱۱۵،

(غ)

غازی الدین فیروز جنگ ۱۳۷،
۱۴۶،
غلام قادر ۱۰۷

علم اللہ ۳۲
علی حضرت ۴۶، ۷۳، ۷۴،
۷۸، ۲۱، ۱۲۴
علی ۵۸،
علی اکبر ۷۹،
علی ابن طیفور بسطامی ۸۹،
علی عادل شاہ ۳۰، ۳۱،
۴۹، ۵۰، ۵۲، ۵۳،
۵۸، ۶۰، ۶۱، ۱۳۲،
علی نامہ ۵۱، ۵۲،
عنایت شاہ ۱۱۱،
عین الدین گنج العلم ۱۱،
عینی ۱۴۱،
فرخ سیر ۱۳۶
فردوسی ۴۶،
فرشتہ ابوالقاسم ۳۲،
فضلی شاہ فضل اللہ ۱۳۷،
فغاں ۱۳۱، ۱۶۰،
فطرت مرزا معز خاں مولوی ۱۵۳،
فیروز ۱۹، ۲۰، ۶۵، ۶۶
۸۱،
غلام علی ۹۷، ۹۸،
غواصی ملا ۴۰، ۴۱، ۴۸،
۶۷، ۷۴، ۷۵، ۷۶،
۷۷، ۸۰، ۹۲، ۹۳،
۱۳۲
غوث نامہ ۱۱۹
(ف)
فاروقی ۸۲، ۸۵، ۸۶،
فائز ۹۸،
فتح اللہ شیرازی ملا ۳۰،
فتح شریف ۱۲۲،
فتح نامہ نظام شاہ ۴۳،
فراقی سید محمد ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۰، ۱۶۱،
قصص الانبیا ۵۹،
قصہ بے نظیر ۴۴،
قصہ حسینی ۹۳،
قطبی ۸۲،
قطب شاہی سلطنت ۲۸، ۷۷،
۸۷، ۹۶، ۱۱۶،
قطب شہر ۶۹،
قطب مشتری ۷۰، ۷۱

فیروزشاہ بہمنی ۱۱، ۱۲، ۱۴
(ق)
قادر ۶۰، ۹۹، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸
قائم قیام الدین ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۶۶، ۱۶۷
قدرتی ۵۹
قصہ ابوشحمہ ۹۳
کنور منوہر ۵۲
(گ)
گجرات ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۹۹، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۳
گلبرگہ ۱۰، ۱۴، ۵۸
گلدستہ عشق ۵۲
گلزار السالکیں ۸۳
گلشن احسان ۱۱۸
گلشن حسن و دل ۱۲۰
گلشن عشق ۵۱، ۵۲
قندھار ۱۰، ۲۱
(ک)
کام بخش ۱۳۶
کدم راؤ ۱۵
کربلا ۱۰۲
کرناٹک ۹، ۲۸
کرنول ۱۰، ۱۴۵
کریم ۵۸
کڑپہ ۱۰، ۴۷، ۴۸، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۷۱، ۷۶، ۱۴۱، ۱۴۴
گوہر سید ۱۴۹
گیسو دراز ۳۶
(ل)
لاری عبدالرزاق ۱۰۲
لال و گوہر ۱۴۷
لشکر خاں نصیر جنگ ۱۴۶
لطفی ۱۷، ۱۸، ۱۹
لطیف غلام علی خاں قزلباش ۹۶
لیلیٰ مجنوں ۷۲

(ختم شد)